ھوپ کی چادر

سید احمد قادری

دھوپ کی چادر

[افسانے]

سید احمد قادری

اشاعت : ——— ۱۹۹۵ء
قیمت : ——— /75 روپے   Rs. 75 /=
تعداد : ——— 400
کتابت : ——— ابوالکلام عزیزی
سرورق : ——— نعمت خوالکار
ناشر : ——— سید احمد قادری
طباعت : ——— تنویر آفسیٹ، دہلی

تقسیم کار
مکتبہ غوثیہ
کریم گنج، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱ (بہار) بھارت

MAKTABA GHOUSIA
New Karimganj, Gaya (Bihar)

انتساب

کلام حیدری

کے نام

جس نے مجھے "شہر افسانہ نگاری کا معزز شہری" بنایا

• سیّد احمد قادری

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومت اُتر پردیش
لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع ہوئی

DHOOP KI CHAADAR

(SHORT STORIES)

by

SYED AHMAD QUADRI

ترتیب

افسانے

... بیاں اپنا

میرا پہلا افسانوی مجموعہ "ریزہ ریزہ خواب" ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا تھا اور یہ دوسرا افسانوی مجموعہ "دھوپ کی چادر" ۱۹۹۵ء میں، یعنی پورے دس سال بعد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

پہلے افسانوی مجموعہ "ریزہ ریزہ خواب" کی اشاعت کے بعد جس طرح کے تبصرے، تجزیے اور مقالے ہند و پاک کے ادبی رسالوں میں دیکھنے کو ملے، اس سے نہ صرف حوصلہ بڑھا اور تقویت ملی، بلکہ اور سے اور کی جستجو بڑھی۔ یہی وجہ تھی کہ میرے ذہن پر مشہور افسانہ نگار غیاث احمد گدی کی یہ رائے ہمیشہ چھائی رہی کہ ـــــــ

"جدید تر نسل کے اس نوجوان صاحبِ قلم کو ابھی بہت دور جانا ہے، بہت دور اور بہت اونچائی تک، یہی موصوف کا مطمحِ نظر ہونا چاہئے۔"

اس کے ساتھ ہی ساتھ مشہور دانشور اور نقاد ڈاکٹر اصغر علی انجینئر کے اس خیال کا بھی اسیر رہا کہ ـــــــ

"ریزہ ریزہ خواب، قادری کی بیس کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں بعض کہانیاں کمزور ہیں، بعض اچھی اور بعض بہت اچھی بھی۔"

ڈاکٹر اصغر علی انجینئر کی رائے میں اچھی اور بہت اچھی سے زیادہ "بعض کہانیاں کمزور ہیں"۔

کو میں نے زیادہ اہمیت دی اور بہت دنوں تک یہ سوچتا رہا کہ میری بعض کہانیاں کمزور کیوں ہیں، کون سی کمی، کون سی خامی رہ گئی، جس نے میری کہانی کو کمزور بنا دیا اور میں ان ہی سوالات کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش میں لگا رہا اور اب پوری ایک دہائی کے بعد میرے یہ افسانے ان گتھیوں کو سلجھانے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں، اس کا فیصلہ اب ہمارے قارئین اور ناقدین کو کرنا ہے۔

مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ میری افسانہ نگاری کے سلسلے میں جب بھی باتیں ہوئیں، مجھے تیسری آواز کا نمائندہ افسانہ نگار قرار دیا گیا۔ یعنی ترقی پسندی اور جدیدیت کی انتہا پسندی سے الگ ہٹ کر ایک نئی آواز، جس آواز میں داخلیت اور خارجیت دونوں کے احساسات و جذبات شامل ہوں۔

اب سے دس سال قبل میں نے جو اسلوب اپنایا تھا وہی بیانیہ اسلوب آج کے تخلیقی اظہار کا نہ صرف غالب اسلوب ہے بلکہ اسی بیانیہ اسلوب کی وجہ کر آج ایک بار پھر افسانہ اور قاری کے درمیان ٹوٹا رشتہ قائم ہو سکا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ علامتی، استعاراتی، تجریدی نظام اظہار نے اردو افسانوں کو قاری سے بہت دور کر دیا تھا، جس کے ذمّہ دار وہ افسانہ نگار تھے جو ۶۰ سے ۷۰ کے درمیان سامنے آئے اور شہرت کے بھوکے نقّادوں نے انھیں خوب خوب شہرت کے بانس پر چڑھانے کی کوشش کی اور اس نسل کی وقتی اور جھوٹی شہرت سے وہ لوگ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے جو افسانوی ادب میں ایک پہچان اور مقام بنانے میں نہ صرف کامیاب ہو چکے تھے بلکہ اپنے اسلوب، آرٹ، تکنیک، موضوع اور فکر و احساس کی معنویت، تنوع اور ندرت سے اردو کے افسانوی ادب میں اضافہ کر رہے تھے۔ غیاث احمد گدّی، رام لعل، کلام حیدری، جوگندر پال، احمد یوسف وغیرہ اسی قبیل کے فنکار تھے۔ لیکن انھیں جلد ہی اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا اور شہرت کے بھوکے نقادوں کے بچھائے جال سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔ سب سے بُرا وقت ان پر پڑا جو ۶۰ء سے ۷۰ء کے درمیان اُبھرے اور اپنی پہچان ہی بحیثیت علامتی، استعاراتی، تمثیلی اور تجریدی افسانہ نگار کے کرائی تھی۔ اس دوران ۷۰ء سے ۸۰ء کے درمیان اُبھر کر ایک نئی تازہ دم اور ذہین نسل سامنے آ چکی تھی۔ جس نے اپنے گہرے مطالعے اور مشاہدے کی روشنی میں ایک جانب ترقی پسندوں کے منشوری ادب سے

انحراف کیا تو دوسری طرف جدیدیت کے علمبرداروں کی قنوطیت، جبریت، مجرد داخلیت اور عصری مسائل سے شعوری انحراف کے عمل کو رد کرتے ہوئے اپنے افسانوں میں داخلیت اور خارجیت کے شعوری عمل، عصری مسائل، سماجی رشتوں، تہذیبی زوال اور اس نوع کے دوسرے عصری تقاضوں کو اپنے افسانوں کا نہ صرف موضوع بنایا بلکہ اسے متنوع، بالیدہ اور بامعنی بناتے ہوئے بیانیہ طرز اظہار کو قبولیت بخش کر کہانی پن پر زور دیا اور اس کی مقبولیت بڑھتی گئی، جسے دیکھ کر اس نئی نسل کی تقلید میں وہ نسل بھی شامل ہو گئی جس نے ان عوامل کے خلاف نہ صرف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے ان سے حتی الامکان گریز کیا تھا اور اپنی انفرادیت پر اصرار کیا تھا۔

میں جس وقت افسانوی دنیا میں داخل ہوا، اس وقت تجریدیت کا دور دورہ تھا۔ علامتوں، تشبیہوں اور استعاروں کو خاصی اہمیت حاصل تھی۔ اینٹی ہیرو، اینٹی کلائمکس، اینٹی اسٹوری اور شعور کی رو پر مبنی افسانے لکھے جا رہے تھے۔ جو افسانے جتنے گنجلک اور فہم سے دور ہوتے اتنے ہی کامیاب تھے۔ جنھیں لوگ اپنے اپنے طور پر سمجھ رہے تھے اور جو نہیں سمجھ رہے تھے، ان کے لئے شرحیں فراہم کی جا رہی تھیں ــــ ایسے میں میرے کئی اہم افسانے مثلاً "سرخ جوڑے" "آنگن کی بات" "یادوں کا المیہ" "احساس" "قیدی" "شہر خموشاں" "فاصلہ قریب کا" "اداسیاں" اور "لمحوں کی بازگشت" وغیرہ بے وقت کی چیز معلوم ہو رہے تھے۔ لیکن مجھے اپنے ان افسانوں پر پورا اعتماد تھا کہ میرے یہ افسانے حساس ذہن کے تار کو جھنجھوڑیں گے ضرور۔ اور یہی ہوا، ایک وقت ایسا آیا جب ایسے افسانوں کی اہمیت تسلیم کی جانے لگی۔ حالانکہ فیشن زدگی کے اس دور میں بعض نقادوں کے لئے میرے اور میری نسل کے لوگوں کے لکھے گئے افسانے سوالیہ نشان بنے، لیکن بدلتے وقت اور حالات کے تیور کے آگے ان نقادوں کو سپر ڈالنا پڑی اور افسانے کی ابہام وتفہیم کے لئے فرائیڈ، یونگ اور سارتر کے نظریات کی عینک اتار کر افسانوں کے اندر ابھرنے والے نظریات اور فطری کینوس کی نشاندہی کرنے لگے ــــ اور ان لوگوں کی آواز میں اپنی آواز ملانے پر مجبور ہوئے، جو سمجھ رہے تھے کہ فیشن زدگی کا یہ دور بالکل وقتی ہے اور وہی افسانے اپنی پہچان کرانے میں کامیاب ہوں گے اور زندہ رہیں گے

جن میں ماجرا سازی اور کردار نگاری پر زور دیا گیا ہو، سماج اور زندگی کی حقیقتوں کے واضح اظہار پر قدرت رکھتے ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ میرے افسانے ڈاکٹر اصغر علی انجینئر، ڈاکٹر عبدالمغنی، ڈاکٹر تارا چرن رستوگی اور ڈاکٹر علیم اللہ حالی وغیرہ جیسے اہم نقادوں کی توجہ مرکوز کرانے میں کامیاب رہے۔ ڈاکٹر اصغر علی انجینئر نے میری افسانہ نگاری پر تنقیدی اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"جدیدیت نے افسانے کو کچھ یوں مسخ کیا کہ حقیقت افسانہ بن کر رہ گئی۔ ادھر کچھ نئے لکھنے والوں نے جدیدیت سے اور اس کی لایعنیت سے منھ موڑ کر حقیقت پسندانہ رویّہ اختیار کیا ہے۔

زندگی کی حقیقت اپنے کو منوا کر ہی رہتی ہے۔ ادب بھی وہی زندہ رہے گا اور مقبول ہوگا، جو زندگی کی حقیقتوں کو سنجیدگی سے برتے، اس کی نفی نہ کرے۔ سیّد احمد قادری زندگی کی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں اور زندگی اور اس کے پیچیدہ تقاضوں سے اپنی کہانیوں میں بخوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ کہانی ان کے یہاں کہانی ہی رہتی ہے۔ کیونکہ کہانی کہنے کا فن انھیں خوب آتا ہے۔ یہ زندگی کو پھلتے پھولتے دیکھنا چاہتے ہیں اور یہی ان کی نظریاتی وابستگی ہے۔ سارتر کے مطابق لکھنے کا فعل ہی وابستگی کا اعلان ہے اور قادری کی ہر کہانی یہ اعلان مبہم نہیں بڑے واضح طور پر دھیرے نہیں بہانگ دہل کرتی ہے۔"

میرے افسانوں کے بیانیہ اسلوب اور متنوع موضوعات نے ڈاکٹر علیم اللہ حالی کو بھی متوجہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں ـــ

"سیّد احمد قادری کا موضوعاتی RANGE خاصا وسیع وعریض ہے۔ ان کے افسانوں "کنارہ دور" "اجنبی راہیں" "شہر خموشاں" "لمحوں کی بازگشت" "یادوں کا المیہ" "گمشدہ اُجالے" اور "قیدی" وغیرہ کے ذریعہ جہاں موضوعاتی وسعت اور تنوع کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں ان کا یہ مخصوص اسلوب بھی ظاہر ہوتا ہے کہ

وہ بیانیہ پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ وہ الفاظ و علائم کی ساحری سے ہمیں لبھانے
کی کوشش نہیں کرتے، وہ خارجی واقعات و واردات سے اخلاقی نکتے پیدا کر کے
اپنی تخلیقات کی معنویت اور افادیت منوا لیتے ہیں۔ معاصر افسانہ نگاروں میں وہ
اپنی انسانیت دوستی، اقدار نوازی، غایت سنجیدگی اور متانت کی وجہ سے صاف
صاف پہچانے جاتے ہیں۔ کلام حیدری نے انھیں شہر افسانہ نگاری کا معزز شہری کہا
ہے۔ ان کا یہ اعزاز متذکرہ بالا خصوصیات سے قائم ہوتا ہے"۔

نقادوں کے ساتھ ساتھ وہ افسانہ نگار بھی میرے اسلوب، ماجرا سازی اور کردار نگاری کی
تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکے جو علامتی اور تجریدی نظامِ اظہار کو ژولیدہ بیانی اور فنکارانہ خامکاری تصور
کر رہے تھے۔ غیاث احمد گدی کے خیالات میرے افسانوی سفر میں روشنی بخشتے رہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

" جدید اردو فکشن کی دنیا میں سید احمد قادری کی آمد علامتی اور تجریدی نظامِ اظہار
کے نام پر ژولیدہ بیانی اور فنکارانہ خامکاری کی بوجھل فضا میں ہوا کے خوشگوار
جھونکے سے کم نہیں۔
اظہار و بیان کی صفائی، ماجرا سازی اور کردار نگاری کا دروبست، تہہ در تہہ
زندگی کا عرفان اور اس سے گہری وابستگی سید احمد قادری کی تخلیقی جہت کی نمایاں
پہچان ہے"۔

میرے افسانوں کے کردار اور واقعات اجنبی نہیں۔ میں ان ہی واقعات اور حادثات کو اپنے
افسانوں کا موضوع بناتا ہوں، جنھیں میں نے بہت قریب سے دیکھا، سمجھا اور شدت سے محسوس کیا
ہے۔ بلکہ بعض بالکل سچے واقعے کو میں نے افسانے کا روپ دیا ہے جس کے کردار مثلاً "تشویش" کے
قاسم بھائی، "ریت کی دیوار" کا "میں" "عزت دار" کے اختر میاں اور ارشد "بے بسی" کی غزالہ،
"دوپہر" کا رامو "ہم قدم" کا میں اور رمیش "خلیج" کا انور اور "اولڈ پیپلس ہوم" کے تفضل حسین
وغیرہ بالکل سچے، جیتے جاگتے اور ہمارے آپ کے ارد گرد کے کردار ہیں۔ ایسے کرداروں سے روز،

صبح و شام ملاقات ہوتی ہے۔ ان کی حرکات و سکنات، ان کی زبان اور ان پر گزری کہانی ـــــ ہی میرے افسانے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ حالات اور واقعات بدل جاتے ہیں۔ اس لئے افسانوں کے موضوعات بھی وقت کے لحاظ سے بدلنے چاہئیں، ضرور بدلنے چاہئیں لیکن ان موضوعات کا کیا کیا جائے، جو کل تھے وہ آج بھی ہیں۔ غربت، مفلسی، استحصال، فرقہ داریت، ظلم اور تشدد۔ یہ سب کے سب کل جتنی شدّت کے ساتھ ہمارے سماج کے لئے ناسور تھے، آج بھی اسی شدّت کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ہاں عصری آگہی اور عصری تقاضے ضرور بدلے ہیں ـــ اور ان ہی آگہی اور تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے کوئی بھی ادب کا فن پارہ مکمل ہو سکتا ہے۔

گزشتہ دس برسوں میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر کئی انقلابات رونما ہوئے، روس جیسی بڑی طاقت کا بکھراؤ، منڈیلا کی آزادی اور اس کی اپنی حکومت کا قیام، امریکہ کی بڑھتی ہوئی طاقت، اسرائیل اور ایران کی دوستی، ایل۔ٹی۔ٹی کا زور، پاکستانی مہاجروں کی بے پناہی اور ان کی بغاوت، بابری مسجد کا انہدام، فرقہ پرست سیاسی و غیر سیاسی جماعتوں کے بلند حوصلے، اقتدار کی ہوس، کانگریس (۱) جیسی بڑی جماعت کے بدلتے نظریے اور اس کا بکھراؤ، بھارت کے مختلف صوبوں میں برہمن واد کا خاتمہ، کشمیر میں ظلم و ستم کا بڑھتا طوفان، ریزرویشن پالیسی کے مثبت و منفی نتائج اور سیکولر طاقتوں کی خود سپردگی۔ ـــــ وغیرہ جیسے حادثات اور واقعات عہد حاضر کی زندگی پر بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر انداز ہو رہے ہیں۔ اور ادب کا حصہ کسی نہ کسی شکل میں بن رہے ہیں ـــ ادب وہی زندہ رہتا ہے جو اپنے عہد کی تہذیب تمدن، معاشرت اور سماج کی آگہی اور تقاضوں کو پورا کرتا ہے ـــ چنانچہ متذکرہ بالا حالات و کوائف سے آج کا حساس ذہن متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا اور ایک تخلیق کار، ان حادثات کو اپنی تخلیقات میں تمام تر فنی اور فکری وسعتوں کے ساتھ سمو دیتا ہے جو ادب کا ایک اہم حصہ بن جاتا ہے ـــ اس طرح کے احساسات و جذبات میرے افسانوں میں تلاش کئے جائیں تو جا بجا مختلف شکل و صورت میں ضرور مل جائیں گے۔

اپنے افسانوں کے حوالے سے اردو افسانوں پر میں نے لمبی بحث کر ڈالی۔ اب اپنی بات ختم کرتے ہوئے چند باتیں مزید عرض کردوں کہ اس مجموعہ کے بیشتر افسانے آل انڈیا ریڈیو کے مختلف مراکز مثلاً نئی دہلی، پٹنہ، گورکھپور، لکھنؤ، بھاگلپور اور جے پور وغیرہ کی فرمائشوں پر لکھے گئے ہیں جس میں وقت کے ساتھ ساتھ کئی طرح کی پابندیوں کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ اس لئے کئی ایسے افسانے جو مزید پھیلاؤ اور تفصیلات چاہتے تھے، وہ میں نہ کرسکا اور کچھ باتیں جو صاف صاف کہنی چاہئے تھیں وہ میں نہیں کہہ سکا، بلکہ اشارے کنائے کا سہارا لیا ہے۔

میں آل انڈیا ریڈیو کے متذکرہ بالا مراکز کے افسران کے ساتھ ساتھ ان رسائل کے مدیران کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے بیہم اصرار کر کے مجھ سے افسانے لکھوائے ـــ اور مصروف تر زندگی میں میرے اندر کے افسانہ نگار کو نہ صرف زندہ رکھنے بلکہ متحرک رکھنے کی کوشش کی ہے۔

میں فخرالدین علی میموریل کمیٹی، حکومت اتر پردیش، لکھنؤ کا بھی ممنون ہوں، جس کی مالی اعانت سے اس افسانوی مجموعہ کی اشاعت ممکن ہو سکی۔

میں اپنے ان دوستوں اور بزرگوں کا بھی سپاس گزار ہوں، جنہوں نے کسی نہ کسی شکل میں اس کتاب کی اشاعت میں تعاون دیا۔

سیّد احمد قادری

اپنی عدالت

گرمی قہر ڈھا رہی تھی۔ صبح کے نو بجتے ہی ہر طرف گرم ہوا کے تیز جھکڑ چلنے لگتے۔ اور دوپہر ہوتے ہوتے لگتا جیسے سورج بس سوا نیزے پر آ گیا ہے۔

لیکن شہر سے صرف پچیس کیلو میٹر دور چٹیل میدان سے تھوڑا ہٹ کر تیس چالیس جھونپڑیوں کے گاؤں رام نگر کے لوگوں کو دیکھ کر ایسا لگتا، جیسے ان پر گرمی اور لُو کا کوئی اثر ہی نہیں۔ صبح سے شام تک وہ لوگ بالکل عام دنوں کی طرح اپنے کام میں مشغول رہتے۔ دراصل غربت اور مفلسی نے ان کے جسم کی چمڑی کو اتنی موٹی بنا دیا تھا کہ ان پر گرم، سرد کا احساس ہی جاتا رہا، احساس رہتا تو صرف پیٹ کا، وہ کیسے بھرے۔

اس گاؤں کی عورتیں اور مرد، صبح ہوتے ہی اپنے اپنے کام پر نکل جاتے۔ ان کے اپنے گاؤں میں کام کے مواقع کم تھے۔ لیکن اس گاؤں سے دو کوس کی دوری پر ایک بڑا گاؤں ناتھ نگر تھا جہاں بسے بڑے لوگوں کی وجہ کر انھیں کام کی کمی نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کی روزی روٹی کا مرکز یہی گاؤں تھا۔ صبح ہوتے ہی رام نگر کے علاوہ آس پاس کے کئی گاؤں کی غربت زدہ عورتیں اور مرد یہاں پہنچ جاتے اور ٹھاکر نریش سنگھ اور دوسرے کئی بڑے کسانوں کے کھیتوں کھلیانوں اور گھروں کے کام پر جٹ جاتے، جنھیں ٹھاکروں کے یہاں کام نہ ملتا، وہ کسی کے گھر کا چھپر چھاتے، جوتے

چہل مرمّت کرتے، گائے بھینس چراتے اور اُن کے بچّے ننگ دھڑنگ گاؤں کے اِرد گِرد لکڑیاں چُننے، سوّر چرانے اور کھیل کود میں مشغول رہتے۔ یہی ان کی دنیا تھی۔ سورج کی تپش سے ان چہرے کالے اور سیاہ ہو چکے تھے، گاؤں میں اسی طرح گھومتے، کھیلتے کودتے یہ بچّے بڑے ہوتے اور پھر اپنے باپ دادا کے قدموں کے نشان پر چلنے لگتے۔

ان ہی لوگوں میں ایک راگھو رام تھا۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ چالیس کی ہوگی۔ لیکن مفلسی اور غربت نے اس کے چہرے اور جسم پر اس طرح سایہ ڈال رکھا تھا کہ وہ پچپن ساٹھ کا بوڑھا نظر آنے لگا۔ چھوٹی عمر کی شادی کے رواج نے اسے جلد ہی ایک بیٹی کا باپ بنا دیا جو گاؤں کے دوسرے بچّوں، بچّیوں کے ساتھ گاؤں کے اندر کھیلتی کودتی جوان ہوگئی ـــــ کہا جاتا ہے کہ جوانی میں کتیا بھی اچھی لگتی ہے اور وہ تو ایک نوخیز دوشیزہ تھی، اس نے عمر کے چودھویں زینے پر قدم ہی رکھا تھا کہ اس کے انگ انگ سے حُسن و شباب پھوٹنے لگا۔ راگھو کی جورو متیا کی طرح اس کے چہرے کے بھی نقوش بڑے تیکھے تھے۔ سانولے سلونے چہرے پر جوانی اور کھلتے شباب نے اسے اس گاؤں کی حسینہ بنا دیا تھا۔ بچپن میں اس کے صاف رنگ اور تیکھے نقش و نگار کو دیکھ کر راگھو اور متیا نے اس کا نام سُندری رکھ دیا تھا، اس کا صاف رنگ تو دھیرے دھیرے تیز دھوپ اور گاؤں کی گرد و غبار میں جل گیا لیکن چہرے کی خوبصورت بناوٹ اور اس پر قیامت کی جوانی ـــــ پورے گاؤں کے نوجوانوں کی وہ مرکز بن گئی تھی۔

سُندری ایک طرف جہاں پورے گاؤں کے نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن بنی ہوئی تھی، دوسری طرف اپنی مائی اور باپو کے نئے مصیبت اور پریشانی کا باعث تھی۔ ان دونوں کو ... ہر لمحہ، ہر پل یہی فکر ستائے رہتی کہ کیسے جلد سے جلد سُندری کے ہاتھ پیلے کر دئے جائیں۔

راگھو کی نگاہ میں اسی گاؤں کے سادھو رام کا بیٹا سُکھک تھا جو اس کی بیٹی کے لئے اچھا جوڑا ثابت ہوتا، سُکھک ایک تیز و طرار نوجوان تھا، راگھو نے اکثر ناتھ نگر کے ٹھاکر صاحب کے یہاں اسے تیز آواز میں بولتے سنا تھا، اور اس کی اسی ادا سے وہ بے حد متاثر تھا۔ ٹھاکر صاحب کے سامنے

تیز آواز میں بولنا بڑی ہمت اور جرأت کا کام تھا۔ اس لئے راگھو کو یقین تھا کہ وہ اس کی بیٹی کو اچھی طرح اپنی جورو بنا کر رکھ سکتا ہے۔

راگھو نے ایک دن سادھو رام سے شادی کی بات چلائی، تو اسے ایسا لگا جیسے وہ لوگ پہلے ہی سے تیار بیٹھے تھے، جہیز کے نام پر ایک کھٹیا اور پانچ سو روپے طے ہو گئے۔ شادی کی تاریخ اگلے لگن میں ٹھاکر صاحب کی فصل کٹنے اور پیسے و اناج ملنے کے بعد رکھی جائے گی۔

سُندری کی شادی کی بات جس دن طے کر کے راگھو اپنی جھونپڑی میں آیا، اس دن اسے بڑا اطمینان سا لگا۔ ایسا لگا، جیسے اس کے سینے پر سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔ سُندری کی مائی کو اس نے جب شادی طے ہو جانے کی بات بتائی، تو وہ بھی خوشی سے کھل اُٹھی۔ بہت دنوں بعد اس کی ویران آنکھوں میں چمک اور سوکھے ہونٹوں پر مسکراہٹ تیر رہی تھی، وہ اسی دن سے سُندری کے بیاہ کی تیاری میں لگ گئی

سُندری کو بیاہنے کے لئے راگھو کو پانچ سو روپے بھی جمع کرنے تھے، اس لئے وہ ٹھاکر صاحب کے کھیت میں زیادہ دیر تک کام کرنے لگا، تاکہ پیسے زیادہ سے زیادہ ملیں، لیکن کمزور جسم زیادہ بوجھ برداشت نہ کر سکا اور ایک دن وہ کام کر کے لوٹا، تو اس کا بدن جل رہا تھا، اس کی بیوی نے اس کا اداس اور بجھا چہرہ دیکھا تو پوچھ بیٹھی۔

"کا بات ہے آج تو بڑا سُست ہا۔"

"نا کچھو نا، تنی ماتھا میں درد ہے۔" راگھو نے نقاہت بھرے لہجہ میں جواب دیا، اور جھونپڑی کے اندر، زمین پر پڑے ایک کھیندڑا (دری) پر لیٹ گیا۔ متیا نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو چونک پڑی، اسے تیز بخار تھا۔

"ارے تورا تو تیج جَور (بخار) ہے۔" متیا گھبرا کر بولی۔ اور جلدی سے وہ راگھو کے چہرے اور سر کو پانی سے دھونے لگی۔ اور سُندری کو بغل کے جھونپڑے سے بکری کا دودھ لانے کو بھیجا۔ سُندری بھاگتی ہوئی دودھ لے آئی اور راگھو کے ماتھے اور تلوے پر دیر تک دودھ ملتی رہی۔ راگھو کو آرام ملا

تو وہ سو گیا۔

دوسری صبح راگھو سو کر اُٹھا خود کو بہتر محسوس کیا، لیکن کمزوری بہت تھی، اس لئے کام پر جانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کی بیوی اور بیٹی نے بھی اسے آرام کا مشورہ دیا۔

راگھو نے ناشتہ میں روٹی اور پیاز کھا کر اپنی چلم سُلگائی اور پہلا ہی کش لیا تھا کہ جھونپڑی کے باہر سے کئی لوگوں کے بولنے کی آواز آئی، کوئی اسے پکار رہا تھا، نقاہت کی وجہ کر وہ اُٹھ نہ سکا اور اس نے سندری کو باہر دیکھنے کو کہا۔

سندری باہر گئی تو دیکھا ٹھاکر نریش سنگھ کے بیٹا رمیش سنگھ کے ساتھ کئی لوگ کھڑے ہیں۔ چونکہ اکثر وہ بچپن میں اپنے باپو کے ساتھ مالک کے یہاں جاتی تھی اس لئے ٹھاکر رمیش کو پہچانتے ہی اس نے بڑی ملائیمت سے پوچھا۔

"کا بات ہے؟"

نریش نے غور سے سندری کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا، اس نے اپنے بائیں بازو میں کھڑے اپنے آدمی کو آنکھ ماری اور بولا۔

"کہاں ہے راگھو، بابو جی اسے بلائے ہیں۔"

"باپو کے کل سے جور (بخار) ہے، اور آج کام پر نہ جائب۔" سندری نے بڑے نرم لہجہ میں جواب دیا۔

"اچھا، ٹھیک ہو جائے تو بھیج دیہا۔" نریش یہ کہتا ہوا واپسی کے لئے مڑا اور اپنے لوگوں کے ساتھ چل دیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس کے آنے کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ بچپن میں اس نے سندری کو کئی بار دیکھا تھا لیکن جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد اس کا ناتھ نگر آنا بند ہو گیا تھا۔ وہ واقعی آج اسے قیامت لگی۔ اس کی جوانی اور حُسن کا چرچا ہی اسے آج یہاں تک لے آیا تھا، ورنہ کسی غریب کی جھونپڑی کے قریب ایسے مالکوں کا جانا بھی کسرِ شان تھی۔

سندری نے جھونپڑی کے اندر جاکر اپنے باپو کو بتایا کہ مالک کے لڑکے اپنے آدمیوں کے ساتھ اسے بلانے آئے تھے، کہہ دیا کہ تمہیں تیز جوڑ ہے اور تم آج کام پر نہیں جاؤ گے۔

ٹھاکر رمیش کے آنے پر اسے پل بھر کو حیرت ہوئی۔ لیکن اس نے اپنے ذہن کو جھٹک کر اپنا چلم پھر اٹھالیا۔ وہ کش پر کش لگانے لگا۔ چلم کی چنگاری تیز ہوئی اور پھر صرف راکھ رہ گئی۔

اس دن اس نے بڑے آرام سے گھر میں وقت گذارا۔ بہت دنوں بعد اسے آج گھر میں رہنے کا موقع ملا تھا، جو اسے بڑا اچھا لگا ــــ متیا دوسرے گاؤں سے کسی کی مری ہوئی مرغی لے آئی تھی، جسے اس نے بڑے اہتمام سے پکایا اور پھر تینوں نے ایک ساتھ سیر ہو کر مرغی کا گوشت اور روٹی کھائی اور معمول کے مطابق چلم پیتے اور گپ شپ کرتے ہوئے تینوں سو گئے۔

رات کا ابھی پہلا پہر بیتا ہو گا کہ اچانک کسی آواز سے راگھو کی نیند ٹوٹ گئی، ٹمٹماتی ڈھبری کی روشنی میں اس نے اپنا سر گھما کر دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا ــــ

"ای کا ــــ؟" اس کی زبان سے بے اختیار نکلا اور اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

اس کی جھونپڑی کی ٹٹی (دروازہ) ہٹا کر چار آدمی اس کی جھونپڑی کے اندر کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تیز چمکتے ہوئے ہتھیار تھے۔ ان میں سے تین آدمیوں نے ان دونوں میاں بیوی کو جکڑ لیا۔ ان کی چیخ سن کر پاس ہی سوئی سندری بھی گھبرا کر اُٹھ بیٹھی اور اس نے بھی جو منظر دیکھا، اسے دیکھ کر پہلے تو وہ بہت گھبرائی۔ لیکن جلد ہی اس کے ہوش و حواس قابو میں آگئے، اور وہ چیختی ہوئی گالیاں بکتی ہوئی ان تینوں پر ٹوٹ پڑنے کے لئے بڑھی کہ اچانک ایک چوتھے آدمی نے بڑی تیزی سے دبوچ لیا اور بولا۔

"اُدھر کہاں جا رہی ہے میری جان، اِدھر آجا ــــ"

آواز سن کر سندری کے ساتھ ساتھ اس کی مائی اور باپو چونک اُٹھے اور خوف و دہشت سے کانپ گئے۔

"ارے مالک یہ تو ہا۔" بے اختیار تینوں کی زبان سے نکلا۔ تینوں حیرت میں پڑ گئے کہ مالک ٹھاکر نریش سنگھ کا لڑکا رمیش سنگھ ایسی حرکت کیوں کر رہا ہے۔ لیکن تینوں کو زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملا اور تینوں کے منھ پر پوری طاقت سے کپڑے باندھ دئے گئے۔ تینوں کی آواز اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئی۔ راگھو کو دو آدمیوں نے رسیوں سے جکڑ دیا اور تیسرے نے متیا کو قابو میں کرلیا اور پھر رمیش نے بڑے اطمینان سے سندری کو اپنی بانہوں میں اُٹھالیا۔

سندری نے اس درندہ سے خود کو چھڑانے کے لئے اپنی پوری طاقت لگادی، بڑی مزاحمت کی، لیکن اسے کامیابی نہیں ملی اور وہ کسی باز کے چنگل میں جکڑے پرندے کی مانند پھڑپھڑاتی رہ گئی۔ اس نے چلّانے کی بھی کوشش کی، لیکن اس کے منھ پر کپڑا بندھا تھا۔ سندری کے ساتھ ساتھ راگھو اور متیا کو بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ چاروں کس مقصد سے یہاں آئے ہیں۔ ان کی نظروں کے سامنے سے رمیش، سندری کو اپنی بانہوں میں بھرے اٹھائے لئے جارہا تھا اور اس کے ماں باپ کی چیخیں اندر ہی اندر دم توڑتی رہیں۔ رمیش سندری کو اٹھائے جھونپڑی کے دوسرے حصہ میں لے گیا اور وہاں سے دیر تک اُٹھا پٹک، کراہ، سسکی، مزاحمت کی آوازیں ڈوبتی اُبھرتی رہیں اور کچھ ہی دیر بعد سندری کی گھٹی گھٹی سی چیخ فضا میں اُبھری اور پھر معدوم ہوتی گئی۔

سندری کی چیخ سن کر متیا اور راگھو تڑپ اُٹھے۔ ان دونوں نے بے قابو ہوکر اٹھنا چاہا، لیکن ان دونوں پر تین آدمیوں کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔

تھوڑی دیر بعد رمیش جھونپڑی کی دوسری جانب سے نمودار ہوا اور اس نے اپنے تینوں آدمیوں کو چلنے کا اشارہ کیا۔ اور اشارہ پاتے ہی وہ تینوں ان دونوں کو اسی حالت میں چھوڑ کر رمیش کے پیچھے پیچھے جھونپڑی سے باہر نکل گئے۔ جاتے جاتے رمیش نے راگھو سے دھمکی بھرے انداز میں کہا۔

"سن لے راگھو، ای بات، کیکرو (کسی سے) جکر (ذکر) کربے تو تو سمجھ لیہے۔"

رمیش کی دھمکی کا جواب راگھو دیتا بھی تو کیسے، وہ تو ہر طرف سے جکڑا ہوا تھا۔

راگھو نے رمیش کے ساتھ آئے ان تین آدمیوں کو بھی ڈھبری کی روشنی میں اچھی طرح پہچان

لیا تھا۔ دھیرو، بجے سنگھ اور گوونداکو وہ اکثر مالک کے گھر پر دیکھتا تھا۔

ان چاروں کے جاتے ہی متیانے رسیوں سے جکڑے راگھو کے ہاتھ پاؤں کھولے۔ اپنے اور اس کے منھ پر سے کپڑے نوچے اور دونوں بھاگتے ہوئے سندری کے قریب پہنچے اور یہ دیکھ کران کا دل دھک سے کر گیا کہ ان کی بیٹی اپنی عزت اور عصمت گنوا کر بے ہوش پڑی تھی۔ دونوں نے پانی کا چھینٹا مار کر سندری کو ہوش میں لایا اور وہ ہوش میں آتے ہی اپنے باپو اور اپنی مائی سے لپٹ گئی اور سسک سسک کر رو پڑی۔ راگھو اور متیا بھی اپنی بے بسی پر اس کے ساتھ مل کر آنسو بہانے لگے۔

کئی دنوں تک تینوں کے آنسو بہتے رہے۔ بے بسی اور بے عزتی کا درد اندر ہی اندر جھیلتے رہے اور تینوں ایک دوسرے سے آنکھیں چراتے رہے۔

راگھو کے سارے ارمان، ساری خوشی ریت کے گھروندے کی مانند ٹوٹتے نظر آئے۔ اس نے اس حادثے کا ذکر اپنے گاؤں والوں سے اسی دن کرنا چاہا تھا، لیکن اس کی بیوی نے اسے عقل دی کہ اگر گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی تو سندری کی شادی میں بہت دقت ہوگی اور پھر رمیش کی دھمکی بھرے الفاظ...... وقتی طور پر راگھو کی سمجھ میں یہ بات آگئی، لیکن ذلت اور رسوائیوں کا وہ لمحہ، اپنی بیٹی کا اداس، بجھا بجھا اور غمگین چہرہ۔ اس کی آنکھیں کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں..... یہ سب راگھو کے گلے کا پھانس بن گیا تھا۔

اور ایک دن اس نے اپنے ایک بہت قریبی دوست بھگت رام سے سارا واقعہ رو رو کر سُنا دیا ــــ بھگت رام پورا قصّہ سن کر آگ بگولہ ہو گیا، اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں، آنکھوں میں انگارے دہکنے لگے اور بول اُٹھا ــــ

"ہم گریب لوگ کے عجّت نہ ہے کا، کچھ نہ کچھ کرے کے چاہی۔"

یہ کہہ کر اُس نے سرگوشیوں میں پولیس کو اطلاع دینے کا مشورہ دیا اور وہ دونوں اسی وقت گاؤں سے ایک کوس پچھم کی جانب واقع تھانہ کی جانب چل پڑے۔

گھنٹہ بھر پیدل چلنے کے بعد دونوں تھک کر چُور تھانہ پہنچے اور راگھو نے تھانیدار سے

رو رو کر اپنی بیٹی کی عصمت دری کی داستان سنائی اور راگھو نے جب ناتھ نگر کے ٹھاکر نریش سنگھ کے بیٹے رمیش سنگھ کا نام لیا تو تھانیدار چونک پڑا اور جلدی سے راگھو کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"اچھا اچھا ٹھیک ہے، تو جاکر اپنی بیٹی کو لے آ' اس کا بھی بیان جروری ہے۔"

تھانیدار کی بات سن کر راگھو اور بھگت نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا' دونوں کو بات ٹھیک ہی لگی کہ دراصل ظلم اور بے عزتی کی شکار تو سُندری ہی ہے' اس لئے اس کے بیان کی اہمیت ہوگی۔ اور وہ دونوں بھاگتے ہوئے اپنے گاؤں پہنچے اور سندری اور اس کی ماں کو بہت سمجھا بجھا کر تھانہ چلنے پر رضامند کیا اور وہ چاروں جب تھکے ہارے پسینے سے شرابور تھانہ پہنچے تو قہر ڈھاتا سورج تھک کر چھپنے لگا تھا۔

تھانیدار نے چاروں کو بہت غور سے دیکھا اور اس کی نظر سندری پر جم گئی۔ بوسیدہ اور گندے شلوار، جمپر کے اندر سے اس کا شباب جھانک رہا تھا۔ غموں سے نڈھال اور دھوپ کی تمازت نے سندری کے چہرہ کو پژمردہ کردیا تھا' لیکن اس کے انگ انگ سے جھانکتی جوانی تھانیدار کے سامنے قیامت ڈھا رہی تھی۔

کئی منٹ تک وہ اسے غور سے دیکھتا رہا اور پھر بولا ـــ

"تو' تورا ساتھ جیادتی ہوا ہے' کیسے کیسے ہوا' بتاؤ۔"

تھانیدار کی بات سن کر سندری ڈبڈبائی آنکھوں اور رندھے گلے سے' اپنے اوپر ہونے والے ظلم و زیادتی اور آبروریزی کی داستان تفصیل سے سُنانے لگی۔

پوری تفصیل سننے کے بعد تھانیدار نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا ـــ

"دیکھو' یہ سب تو ہر جمانہ میں ہوا ہے' تم لوگوں کو ٹھاکر صاحب کے کھلاپھ شکایت لکھا کر کوئی پھائدہ نہیں ہوگا۔ اب تو عجت واپس ملے گی نہیں' اس لئے اچھا ہوگا اگر تم لوگ کچھ روپیہ پیسہ لے دے کر معاملہ رپھع دپھع کردو' ویسے بھی تم لوگ ٹھاکر صاحب کے رعب اور پیسہ کے سامنے ٹکو گے نہیں۔"

تھانیدار کی پوری بات سن کر ان چاروں کے گھبرائے اور پریشان حال چہرے زرد پڑ گئے۔ وہ لوگ تو انصاف مانگنے اور ظالموں کو سزا دلوانے آئے تھے۔ لیکن یہ تھانیدار تو دوسری ہی بات کر رہا ہے۔

چاروں نے ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں دیکھا اور تھانیدار کی نیت کو سمجھتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور واپسی کے لئے دروازے کی جانب بڑھنے لگے۔

تھانیدار نے انھیں واپس جاتے ہوئے دیکھا تو پوچھا ـــــ

"تو تم لوگوں کا 'کا پھیصلہ ہے ـ ؟"

"ہم گھر جا کے سوچب (سوچیں گے)"

یہ کہتا ہوا راگھو دروازے کی جانب مڑ گیا۔ اس کے پیچھے متیا، سندری اور بھگت بھی تھے۔ جاتے جاتے تھانیدار کی آواز گونجی۔

"ارے سنو تو۔ شام ہو گئی ہے، تم سب لوگوں کو گاؤں پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی۔ جمانہ ٹھیک نہیں ہے، اس لئے تم لوگ رات میں یہیں رُک جاؤ"۔

راگھو نے مڑ کر تھانیدار کو دیکھا، اس کی نگاہیں سندری کے جسم کو ٹٹول رہی تھیں۔ اس ہمدردی کے پیچھے چھپے مطلب کو سمجھتے ہوئے راگھو نے جواب دیا۔

"نہ ہم نی رات ہودے سے پہلے ہی گاؤں پہنچ جاب"۔

تھانیدار، راگھو کا جواب سن کر خاموش ہو گیا اور ان لوگوں کو اداس نظروں سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پاس کھڑے کئی سپاہی تھانیدار کو دیکھ کر مسکرا اُٹھے۔

وہ چاروں تیز قدموں سے گاؤں کی طرف بڑھنے لگے۔ لیکن ان چاروں کے دل و دماغ میں طرح طرح کے خیالات ڈوب اُبھر رہے تھے۔

وہ سب ایک میل کا فاصلہ طے کر کے جیسے ہی ایک پگڈنڈی پر مڑے، دوسری پگڈنڈی پر دوسرے گاؤں سے آتے ہوئے ان کی جان پہچان والے ڈومر پاسبان سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے

ان چاروں کے اداس اور بے جان چہروں کو حیرت سے دیکھا ۔

"کا بات ہے، راگھو بھیا، کونو پریسانی کے بات ہے کا، کہاں سے توسب آوَتا۔"

راگھو نے چند لمحے سوچا کہ اسے ساری بات بتائی جائے یا نہیں۔ وہ ڈومر کو اچھی طرح جانتا تھا، وہ لوگوں کے دکھ سکھ میں برابر کام آتا اور وہ کردار کا بھی اچھا آدمی تھا ۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے سینے پر کے بوجھ کو مزید کم کرنے کے لئے اسے اپنی پوری رام کہانی سنائی اور آخر میں اس نے یہ بھی بتادیا کہ تھانیدار سے کسی انصاف کی اسے امید نہیں ہے ۔

ڈومر کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر بڑے گمبھیر انداز میں بولا ۔

"اگر ہمرا پر (ہمارے پر) وسواس کرا، تو کل صبح ہمرے گھر آجیہا، ای سب کے لے کے تورا ہم ایک جگہ لے جائب، کل ردلیار ہے، او جگہ کچہری لگی ۔"

"کچہری ؟"

راگھو اور بھگت نے تعجب سے پوچھا ۔

"ہاں، بھیا، توسب جانا نہ ہا کا، او جگہ انصاپھ جرور ملی، او لوگن ہم گریب لوگن پر ہووے والے اتیاچار کے کھلاپھ لڑت ہیں، او لوگ جو پھیصلہ کرہی ہیں، او ایکدم ہو جائی ۔ رام کھلاون سنگھ کے چھا اپنے چھوٹا ادھے لوگ نہ کرلئی، توسب ڈرا مت ۔ کونو گھبرائے کے بات نہ ہے، توسب کل صبح ہمرے پاس جرور آجیہا۔"

یہ کہتا ہوا، وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور ان سب کو پرنام کہتا ہوا اپنے گاؤں کی جانب چل دیا۔

وہ چاروں بھی اپنے گاؤں کی جانب جانے والی پگڈنڈی پر تیز قدموں سے چلنے لگے ۔ گھر پہنچ کر ان چاروں نے کافی سوچ وچار کیا اور فیصلہ کیا کہ اگر انھیں ظلم، زیادتی اور بے حرمتی کا بدلہ لینا ہے تو کچہری جانا ہوگا ۔

یہ فیصلہ کر کے بھگت اپنی جھونپڑی میں چلا گیا اور راگھو، متیا اور سندری کھانا کھا کر سو گئے۔

راگھو کو نیند کی دیوی نے اپنی آغوش میں لے لیا، تو وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی خواب میں

ڈوب گیا۔ خواب ہی ان غریبوں کے جینے کا سہارا ہوتے ہیں۔ آج بھی خواب میں اسے اپنی بیٹی کی بے بس چیخ و پکار سنائی دینے لگی، لیکن پھر جلد ہی اس کے خواب کا منظر بدلا اور اس نے دیکھا کہ رمیش سنگھ کے ساتھ ساتھ اس کے تینوں ظالم ساتھی بھی پھانسی کے پھندے میں جھول رہے ہیں اور رو رو کر گڑگڑا کر اس سے رحم کی بھیک مانگ رہے ہیں اور اس سے جیون دان کی التجا کر رہے ہیں۔ اور وہ ان پر بھرپور قہقہہ لگا رہا ہے اور .... اور ....

اس کی نیند سویرے ہی ٹوٹ گئی۔ اس نے متیا اور سندری کو آواز دی اور پھر تینوں تیار ہو کر بھگت رام کو لے کر ڈومر کے گاؤں کی جانب چل دئے۔

ڈومر ان کا انتظار ہی کر رہا تھا، وہ بھی ان کے ساتھ ہو لیا اور تقریباً ڈھائی کوس پیدل چلنے کے بعد بالکل ویرانے میں ایک باغ نظر آیا جس کے چاروں طرف دھوتی کرتا پہنے، سر پر گمچھا باندھے، ہاتھوں میں بندوقیں اور تیز ہتھیار لئے لوگ کھڑے پہرہ داری کر رہے تھے۔ ان پانچوں افراد کو دیکھ کر ایک بندوق بردار نے انھیں دور ہی سے رکنے کا اشارہ کیا، وہ لوگ رک گئے اور صرف ڈومر آگے بڑھا اور اس نے روکنے والے بندوق بردار کے قریب پہنچ کر کچھ بات چیت کی۔ جس کے بعد انہیں روکنے والے نے ایک دوسرے بندوق بردار کو اپنے پاس بلایا اور اسے ان لوگوں کے پاس کھڑے رہنے کا اشارہ کیا اور خود بندوق اٹھائے باغ کے اندر چلا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ باغ کے اندر سے واپس نمودار ہوا اور ان پانچوں کو اندر چلنے کا اشارہ کیا، ان کے پیچھے پیچھے وہ بندوق بردار بھی چوکنا ہو کر چل رہا تھا۔ کئی مراحل گزرنے کے بعد وہ لوگ باغ کے بیچ و بیچ پہنچے اور ٹھٹھک پڑے۔ وہاں پر بالکل عدالت کا منظر تھا۔

ایک بڑے تناور نیم کے پیڑ کے نیچے ایک بڑا سا ٹیبل اور اس کے پیچھے تین کرسیوں پر دھوتی کرتا میں ملبوس، بڑی بڑی مونچھوں والے بارعب لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹیبل کے دونوں کناروں پر دو اسٹول پڑے تھے جن پر دو منشی نما شخص براجمان تھے۔ ٹیبل کے دائیں جانب فریادی' فریاد کر رہے تھے اور بائیں طرف بندوق برداروں کے گھیرے میں سر جھکائے خوف سے

زرد چہرہ لئے مجرم کھڑے تھے اور ٹیبل کے سامنے دور تک زمین پر پچیس تیس لوگ بیٹھے اپنی فریاد سنانے کی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

یہ پانچوں افراد حیرت سے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے کہ اچانک ایک بندوق بردار نے تقریباً ڈانٹتے ہوئے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور وہ جلدی سے مشینی انداز میں اُن لوگوں کے درمیان بیٹھ گئے۔ اور پھر اطمینان سے عدالت کی ساری کارروائی دیکھنے لگے۔

دائیں جانب اسٹول پر بیٹھا منشی فریادی کا نام پکارتا، فریادی بیچ میں بیٹھی بھیڑ سے اُٹھتا اور ٹیبل کے ٹھیک دائیں جانب کھڑا ہو کر اپنی فریاد سنانے لگتا۔ کرسیوں پر بیٹھے لوگ غور سے فریادی کی بات سنتے، بیچ بیچ میں سامنے رکھے کاغذ پر کچھ لکھتے جاتے اور پھر فریادی کی بات ختم ہوتے ہی تینوں ایک دوسرے سے مشورہ کرتے اور آخر میں بیچ والی کرسی پر بیٹھا بارعب شخص تیز آواز میں فیصلہ سناتا، اس فیصلہ کو بائیں طرف کے اسٹول پر بیٹھا منشی لکھتا جاتا اور پھر وہ مجرموں کی سزا کا پروانہ کاٹ کر پاس کھڑے بندوق برداروں میں سے ایک کے حوالے کر دیتا، مجرم حاضر ہوتا تو اسے مجرموں کی بھیڑ سے باہر نکالا جاتا اور رسیوں سے جکڑ کر بندوق کے سائے میں چار بندوق بردار اسے لے کر آگے بڑھ جاتے اور کچھ ہی دیر بعد اس جانب سے بڑی دلدوز چیخ اُبھرتی۔ ایسی چیخوں پر کوئی چونکتا نہیں، پلٹ کر دیکھتا نہیں، ایسا لگتا جیسے یہ چیخیں بھی معمول کے مطابق ہی ہیں۔ ہاں جو مجرم موجود نہیں رہتے، انہیں راتوں رات اغوا کرنے اور انہیں سنائی گئی سزا دینے کا بھی پروانہ جاری ہو جاتا۔

اس بیچ ایک بندوق بردار راگھو کے قریب آیا اور اسے اُٹھنے کا اشارہ کیا اور جب راگھو حیران و پریشان اٹھ کھڑا ہوا تو بندوق بردار نے اسے فریادیوں کا نام پکارنے والے منشی کے پاس لے گیا۔ منشی نے راگھو کو اوپر سے نیچے تک بڑے غور سے دیکھا اور اس کا نام اور حادثہ کی مختصر رپورٹ پوچھ کر لکھنے لگا۔ اس کے بعد منشی نے اسے واپس اپنی جگہ بیٹھنے کو کہا اور راگھو واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔

چند گھنٹوں کے بعد راگھو اور سندری کا نام پکارا گیا۔ راگھو اپنا نام سنتے ہی کھڑا ہو گیا اس کے ساتھ ہی ساتھ سندری اور متیا بھی اُٹھ کھڑی ہوئی اور وہ تینوں تیز قدموں سے چلتے ہوئے فریادیوں والی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔

"ہاں راگھو سناؤ، تمہاری کیا پھریاد ہے؟"

دائیں جانب والی کرسی پر بیٹھا شخص بارعب انداز میں راگھو سے مخاطب ہوا۔ اور راگھو یہ آواز سنتے ہی ایک بار پھر اپنی درد وغم میں ڈوبی اپنی بربادیوں کی داستان سنانے لگا۔

راگھو کے بعد سندری اور متیا کا بھی بیان ہوا۔ سندری نے اپنی بے عزّتی اور عصمت دری کی المناک کہانی جس انداز سے سنائی اسے سن کر وہاں پر موجود تمام لوگوں کے چہرے غصہ اور نفرت سے تمتما گئے۔

پوری تفصیل سننے کے بعد کرسیوں پر بیٹھے تینوں افراد نے سرگوشیوں میں کچھ مشورہ کیا اور پھر درمیان کی کرسی والا شخص اپنی کرخت آواز میں فیصلہ سنانے لگا۔

"راگھو اور اس کی جورو کو اپنے باہوبل سے جکڑ کر ان کی بیٹی سندری کے ساتھ ناتھ نگر کے ٹھاکر نریش سنگھ کا لڑکا رمیش سنگھ نے اپنے تین ساتھیوں دھیرو، جے سنگھ اور گووندا کے ساتھ مل کر جو کچھ کیا، وہ بہت ہی گمبھیر اور ایمان جنک ہے۔ اس جاتی کے گریب لوگوں کی بھی اپنی عجت ہے، اپنا سوابھیمان ہے۔ اس لئے ہم یہ پھیصلہ کرتے ہیں کہ آج ہی ان چاروں اپرادھیوں کا اپہرن (اغوا) کر کے ان میں سے رمیش سنگھ کا گپتانگ (اعضائے تناسل) اور ناک کاٹ دیا جائے، ساتھ ہی ساتھ بقیہ تین لوگوں کے ناک کان اور داہنے ہاتھ کی ایک ایک انگلی کاٹ دی جائے۔"

فیصلہ سن کر راگھو، متیا اور سندری دنگ رہ گئے، انھیں ایسے زبردست فیصلے کی امید نہیں تھی، ان تینوں کے سوکھے غمزدہ اور پژمردہ چہرے کھل اُٹھے۔

تھوڑی دیر بعد انھیں اطمینان سے بغیر کسی خوف و دہشت کے اپنے گاؤں واپس جانے

کے لئے کہا گیا اور وہ تینوں ڈوم اور بھگت کے ساتھ ساتھ خوشی خوشی واپس چل دئے۔

○

رات آئی، لیکن راگھو، متیا اور سندری کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ آج کی رات انھیں بڑی لمبی لگ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے صبح ہوئی اور راگھو بے قراری کے عالم میں اپنی جھونپڑی سے باہر نکلا تو اس نے محسوس کیا کہ پورے گاؤں میں سراسیمگی پھیلی ہوئی ہے اور ہر کی زبان پر ایک ہی بات تھی۔ ٹھاکر صاحب کے لئیکا (لڑکا) رمیش مالک کے ام۔ سی۔ پی والن (والوں) نے گپتانگ (اعضائے تناسل) اور ناک کاٹ دیلین (دیا) اور ان کر (کے) تین آدمی دھیرو، جئے سنگھ اور گو وندا کے ناک، کان اور ایک ایک انگلی صاپھ (صاف) کر دلین (کر دیا)' اد چارو کے سام بھئی ہے (شام کے وقت ہی) اپہرن (اغوا) ہو گیلے ہلئی اور بھورے (صبح) کھنی گاؤں کے کنارے ندیا کے پاس ادسب ای حالت میں بے ہوس مل لن (ملے) اور .....''

راگھو نے اتنا سن کر اطمینان کی سانس لی۔ اسے اس خبر سے روحانی خوشی محسوس ہو رہی تھی، وہ بھاگتا ہوا اپنی جھونپڑی کے پاس گیا۔ متیا اور سندری اپنی جھونپڑی کے باہر ہی کھڑی تھیں۔ اس نے ان دونوں کو سرگوشیوں میں ساری بات بتائی اور یہ سن کر ان دونوں کے اداس چہرے بھی کھل اُٹھے۔

سارا دن اسی واقعہ کا پورے گاؤں میں چرچا ہوتا رہا، خبر یہ بھی پھیلی کہ ٹھاکر صاحب بڑے غصہ میں ہیں، ان چاروں کو شہر کے اسپتال میں داخل کرادیا گیا ہے، جہاں ٹھاکر رمیش کی حالت بڑی نازک بنی ہوئی ہے۔

خبریں پر لگا کر اڑتی رہیں۔ اور آخر ایک دن ٹھاکر نریش سنگھ اس حادثہ کی تہہ تک پہنچ ہی گئے اور انہیں یہ تفصیل معلوم ہو گئی کہ ان کے بیٹے اور اس کے تین ساتھیوں کے ساتھ ایسا وحشیانہ اور بہیمانہ سلوک کس کی وجہ کر ہوا ہے۔ جس وقت ٹھاکر صاحب کو اس واقعہ کی تفصیل معلوم ہوئی، غصے سے ان کی مٹھیاں بھینچ گئیں اور ان کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔ غصہ میں ان کے منھ سے صرف

اتنا نکلا ـــــ

"اس سالے کی یہ مجال، وہ اپنی اوقات بھول گیا، دیکھوں گا اس حرامزادے کو کہ اسے کتنی عزت پیاری ہے۔"

O

اور ایک رات ـــــ جب رام نگر کے غریب اور مزدور لوگ، دن بھر کی محنت اور مزدوری کرنے کے بعد اپنی اپنی جھونپڑیوں میں تھکے ہارے سو رہے تھے کہ اچانک گولیوں کی ٹھائیں ٹھائیں سے ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ لوگ پوری بات سمجھ بھی نہیں پائے تھے کہ ان کی جھونپڑیاں دھڑا دھڑ جلنے لگیں اور اس آگ کی روشنی دور دور تک پھیلنے لگی۔ ہر طرف آگ، چیخ و پکار، شور، ہنگامے۔ کچھ لوگوں نے اپنی جان بچا کر بھاگنے کی کوشش کی تو انھیں بندوق سے نکلی گولیوں نے بھون ڈالا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا گاؤں شمشان میں تبدیل ہو گیا۔

صبح ہوئی، دوسرے گاؤں کے مندر کے گھنٹے بجے، مسجدوں سے اذان کی صدا اُبھری، لیکن رام نگر میں صبح کا اُجالا نہیں پھیلا۔ ہر سمت جھونپڑیوں سے اُٹھتے ہوئے کالے کالے دھوئیں انسانی لاشوں کے جلنے کی بُو اور زخموں سے چور، چند لوگوں کی کراہ ـــ ایک عجیب وحشتناک اور المناک منظر تھا۔

صبح کے نو بجتے بجتے شہر سے اعلیٰ حکام اور پولیس کے دستے گاؤں کو چاروں طرف سے گھیر چکے تھے۔ دوسرے گاؤں سے آنے والے گاؤں کی یہ حالت دیکھ کر مشتعل ہو رہے تھے اور طرح طرح کے نعرے لگانے شروع کر دئے، اس لئے ان لوگوں کو گاؤں کے باہر ہی روک دیا گیا۔ لاشیں ہٹائی جانے لگیں۔ ایک جھونپڑی سے راگھو، متیا اور سندری کی بھی اکڑی اور جلی ہوئی لاشیں ملیں۔ جھونپڑیوں میں سلگتی آگ کو بجھانے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی تھی۔ لیکن یہ آگ نہ جانے کیسی تھی کہ جیسے جیسے بجھانے کی کوشش کی جاتی وہ مزید بھڑکنے لگتی۔ فائر بریگیڈ والے بھی پہنچ گئے اور کئی

گھنٹے کی کوششوں کے بعد آگ کی لپٹوں پر قابو پایا۔ لیکن اتنی ساری کوششوں اور محنت کے باوجود جگہ جگہ چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔

اس حادثہ سے آس پاس کے گاؤں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ کئی گاؤں اور شہروں میں سر جوڑ کر میٹنگیں ہونے لگیں۔ سرکاری طور پر گاؤں کو نئے سرے سے بسانے اور مارے گئے لوگوں کے رشتہ داروں کو معاوضہ دینے کا بھی اعلان ہوا۔ صوبہ کے کئی وزیر بھی آئے اور گاؤں میں گھوم گھوم کر زندہ بچ رہے لوگوں کی ڈھارس بندھائی۔ اب کچھ نہیں ہوگا، تم لوگ اطمینان سے رہو، پولیس تمہاری حفاظت کرے گی، تم پر اب کوئی ظلم و تشدد نہیں ہونے دیا جائے گا۔

اس گاؤں کے لوگوں کے ساتھ آس پاس کے گاؤں سے آئے لوگوں نے بھی وزیروں اور افسروں کی باتیں سننے کو تو سن لی، لیکن ان کے دلوں میں چنگاریاں دہک رہی تھیں اور ایک دن ——

وہ دن بھی آیا، جب ناتھ نگر پر انسانی قہر ٹوٹ پڑا اور پھر وہی منظر رام نگر کا، ناتھ نگر میں دیکھنے کو ملا —— ہر طرف آگ، خون، چیخ پکار، خوف، دہشت، بھاگ دوڑ ——

دوسری صبح ٹھاکر نریش کے پورے خاندان کے ۱۲ افراد کے سر، دھڑ سے جدا ہو کر گاؤں کے قریب بہتی اگری ندی میں ڈوب ابھر رہے تھے اور ندی کا پانی انسانی لہو سے سرخ ہو رہا تھا —— اور ادھر اس گاؤں سے چند کوس کے فاصلے پر باغ کے اندر عدالت کے فیصلے کی کامیابی پر جشن منایا جا رہا تھا۔
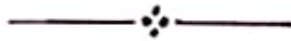
ریت کی دیوار

اور اس دن جیسے آسمان ٹوٹ پڑا ہو اور زمین شق ہو گئی ہو۔ لیکن جو حقیقت سامنے تھی اسے کیسے جھٹلایا جا سکتا ہے۔ اس دن مجھ سے وہ ہو گیا، جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اپنی اس حرکت کے لئے میں خوشی کے شادیانے بجاؤں یا غم کے گہرے اور اندھے کنویں میں چھلانگ لگا دوں۔ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں جیسے سلب ہو گئی تھیں۔

یہ میں نے کیا کر دیا، اپنی بیوی بچے کو، پڑوس والوں کو، پورے سماج کو، پوری دنیا کو تو میں نے دھوکہ دے دیا۔ رہ رہ کر شفقت اور پیار سے منوّر وہ چہرہ میری نظروں کے سامنے گھوم رہا ہے اور اس چہرے سے میں خوف زدہ ہوں، کہ کہیں یہ سچ نہ بول دے، لیکن مُردے بولتے نہیں، میں خود کو سمجھانے کی کوشش کرتا اور کروٹ بدل لیتا ہوں، مگر نیند کوسوں دور کھڑی طنزیہ مسکراہٹ بکھیر رہی تھی۔ ایسی حرکت کے بعد بھی سکون اور اطمینان کی نیند...... ہونہہ!

میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں، شاید.... شاید نیند آ جائے۔ لیکن نیند کے بجائے پھر وہی چہرہ میری بند آنکھوں میں سماتا جا رہا تھا۔ میں چیخ پڑا، میری بیوی چیخ سن کر جاگ پڑی اور گھبراتے ہوئے بولی۔

"کیا ہوا جی؟"

اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں' آخر جواب دیتا بھی تو کیا۔ میرے جواب سے جھوٹ کا پردہ ہٹ جاتا اور میری پوری گھر گرہستی ریت کی دیوار کی مانند ڈھیر ہو جاتی جسے میں نے کھڑی کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

"بس، یونہی، کچھ نہیں' نیند نہیں آرہی ہے"۔ میں نے بیوی سے جھوٹ کا سہارا لیا۔

جھوٹ، ..... جھوٹ ...... اور جھوٹ، میں نے اپنے چاروں طرف جھوٹ کی دیواریں کھڑی کردی ہیں۔

میری بیوی، میرا جواب سن کر' مجھے کچھ عجیب نظروں سے دیکھتی ہوئی کروٹ بدل لیتی ہے۔ اور سونے کی کوشش کرتی ہے۔

میں بستر چھوڑ دیتا ہوں' مجھے بستر پر کانٹے ہی کانٹے محسوس ہوتے ہیں' سکون اور اطمینان کی زندگی جینے کی تمنا میں مجھ سے وہ جرم سرزد ہو گیا جس نے میرا سب کچھ چھین لیا' ——— اپنی بیوی بچے کے سُکھ کے لئے میں نے کتنی بڑی قیمت ادا کی ہے۔ میں اندر ہی اندر گھُٹ رہا تھا کروں بھی تو کیا' کہوں بھی تو کیا.... میرا المیہ یہ ہے کہ میں اپنے سینے کا بوجھ ڈھوتے رہنے پر مجبور ہوں۔ اندر ہی اندر گھُٹتے رہنا اب میرا مقدر بن چکا ہے۔

میری نظروں کے سامنے یادوں کے انگنت چراغ روشن ہو جاتے ہیں اور میں ان جھلملاتے چراغوں میں کھو جاتا ہوں۔

میں اپنے بابا کی گود میں تھا' وہ مجھے پیار کر رہے تھے۔ اور میں ایک کھلونا کے لئے بضد تھا' وہ سمجھا رہے تھے' شام میں وہ کھلونا لا دوں گا' اس وقت ضد نہ کرو' لیکن میری ضد تھی کہ نہیں' مجھے ابھی اور اسی وقت چاہئے اور آخر میری جیت ہوئی۔ بابا میری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتے تھے' وہ مجھے گود میں اُٹھائے بازار گئے اور مطلوبہ کھلونا خرید دیا۔ اور میں کھلونا لے کر خوشی سے اُچھلنے لگا تھا۔

ایک دن بابا کارخانہ سے تھکے ماندے آئے اور مجھے گُم صُم اور خاموش دیکھا تو وہ

بے چین ہوکر جلدی سے مجھے گود میں اٹھالیا اور میری اُداسی کی وجہ پوچھنے لگے ، لیکن میں چپ رہا ان کے کافی اصرار پر میں نے بتایا کہ آپ نے سرکس دکھانے کا وعدہ کیا تھا، لیکن اب تک نہیں دکھایا۔ میری بات سن کر وہ ہنس پڑے ، دیر تک ہنستے رہے۔" بس اتنی سی بات ، میں کل تمہیں ضرور سرکس دکھانے لے چلوں گا ۔" انھوں نے وعدہ کیا اور سچ مچ دوسرے دن جب وہ سویرے ہی کارخانہ سے چھٹی لے کر آ گئے اور مجھے رکشہ پر بٹھاکر سرکس دکھانے لے گئے۔ سرکس دیکھنے کے دوران ایک شیر کا بچّہ سامنے آیا اور اسے دیکھتے ہی میری ضد شروع ہوگئی، "میں وہ شیر کا بچّہ لوں گا ، میں وہ شیر کا بچّہ لوں گا ۔" بابا مجھے سمجھانے لگے ۔ نہیں بیٹے، یہ شیر کا بچّہ سرکس والوں کا ہے۔ یہ کاٹ لیتا ہے، یہ آدمی کو کھا جاتا ہے، لیکن میں نے ایک نہ سنی اور پھر میں رونے لگا۔ میری ضد پر انھیں غصہ آگیا اور ایک چانٹا رسید کردیا .... میرے رونے کی آواز بڑھتی گئی تو وہ پریشان ہوگئے ۔ چانٹا مارنے کا تو انھیں افسوس تھا۔ لیکن وہ کرتے بھی تو کیا، میری ضد ہی ایسی تھی ـــ وہ مجھے گود میں اٹھاکر باہر لے آئے ۔ طرح طرح کی مٹھائیاں، ٹافیاں ، بسکٹ ، اور کھلونے خرید دیئے، لیکن میری ضد برقرار رہی اور گھر پہنچ کر میں روتے روتے سوگیا ۔ صبح جب بابا کارخانہ چلے گئے تو میری موسی نے بتایا کہ بابا رات بھر نہیں سوئے ۔ بار بار وہ مجھے سینے سے لگاتے اور چانٹا مارنے پر افسوس کررہے تھے ۔ موسی سے میں نے یہ بات سنی تو ایک لمحہ کے لئے میرے دل میں ہلچل سی مچی لیکن تھوڑی دیر بعد پھر ضد اور شرارت کا سلسلہ شروع ہوگیا ۔

میں کچھ بڑا ہوا تو بابا نے ایک اسکول میں نام لکھا دیا، لیکن ـــ وہاں بھی وہی شرارت اور کھیل کود ۔ ماں کا سایہ سر سے اُٹھ جانا اور کسی بھی بھائی بہن کی عدم موجودگی اور بابا کے بے جا لاڈ پیار نے مجھے بے حد شوخ اور شریر بنادیا ۔ میرا ہر مطالبہ صرف اس لئے پورا کیا جاتا کہ اس کے وجود پر ماں کا سایہ نہیں ۔ بھائی بہن کی محبت سے بھی یہ بے خبر ہے ۔ ایک بیوہ بوڑھی موسی اور باپ کا سایہ ہی اس پر تھا ۔ اور یہ اسی بے جا لاڈ پیار کا نتیجہ تھا کہ مجھے پڑھائی لکھائی سے کبھی کوئی خاص دلچسپی نہ رہی ۔ شرارت اور کھیل کود ہی میرا مشغلہ تھا، جس کے نتیجے میں کئی بار فیل ہونے کے بعد میٹرک پاس

کر سکا ۔ بابا کا خواب کہ میرا بیٹا پڑھ لکھ کر نام کرے گا ' ادھورا ہی رہ گیا ۔

بابا بوڑھے ہونے لگے تب مجھے نوکری کی فکر ہوئی ' لیکن نوکری جب پڑھے لکھے لوگوں کو نہیں ملتی ' تو مجھے کہاں ملتی ۔ بے روزگاری کا عفریت ہر طرف منھ کھولے نظر آیا ۔ اور یہ حالات کی ستم ظریفی ہی تھی کہ مجھ جیسے بے روزگار لڑکے سے بھی لوگ اپنی بیٹی بیاہنے پر رضامند نظر آئے ۔ کئی لڑکیوں کا رشتہ میرے بابا کے سامنے آچکا تھا ۔ بابا بڑے شش و پنج میں تھے کہ کریں تو کیا کریں ۔ انھوں نے سوچا ممکن ہے شادی کے بعد لڑکی کی قسمت ساتھ دے اور نوکری یا کوئی روزگار مل جائے اور یہی سوچ کر انھوں نے چنچل سے میری شادی کر دی ۔

چنچل بھی اپنی پلکوں پر کئی خواب سجا کر آئی ۔ لیکن اسے گھر کے چاروں طرف افلاس کا سایہ ہی منڈلاتا نظر آیا ۔ دھیرے دھیرے اس کے سارے خواب ' میری بے روزگاری ' افلاس اور بھوک کی حقیقتوں سے ٹکرا ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہونے لگے ' وہ بجھی بجھی رہنے لگی ۔ اس کے ارمانوں کا خون ہو چکا تھا ' اور اس کا لہولہان جسم دن بہ دن کمزور ہونے لگا ۔ اسی درمیان ہم دونوں کے پیار کی نشانی راہل نے جنم لے لیا ۔ ذمہ داری بڑھ گئی ' افلاس کا سایہ اور پھیل گیا ۔ کمانے والا ایک بابا اور کھانے والے کئی ۔ ایسا لگتا گھر کے سب لوگ مل کر بابا کے بوڑھے جسم کا گوشت بھنبھوڑ رہے ہیں میں سوچتا ' اچھا ہوا ماں مر گئی اور بابا نے دوسری شادی نہیں کی ' ورنہ ان کا حشر بھی وہی ہوتا جو آج ہم لوگوں کا ہو رہا ہے ۔

عمر اور فکر سے نڈھال بابا زیادہ بیمار پڑنے لگے اور لمبی بیماری کی وجہ سے اکثر وہ کارخانہ سے غیر حاضر رہنے لگے ' نتیجہ میں ہر ماہ ان کی تنخواہ کٹنے لگی ۔

بابا کی بیماری ' بیوی کی آنکھوں سے جھانکتی بے بسی ' بچے کا بھوک سے بلکنا اور میری بے روزگاری ــــــ میں روز اخبار دیکھتا ' نوکری کے لئے عرضیاں دیتا ' لیکن ہر جگہ پیروی اور رشوت ' میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیتیں ۔ ایک دن اخبار میں نوکری کا کالم دیکھتے دیکھتے میری نظریں ایک خبر پر جم گئیں ــ الو کمپا کے آدھار پر ۵۵ لوگوں کو نوکری ملی ۔ نہ جانے اس خبر نے مجھ پر کیا جادو

کردیا، میری آنکھیں چمک اُٹھیں ـــــ بابا بیمار تھے ـــــ اگر...... اگر انھیں کچھ ہو گیا تو کارخانہ میں مجھے نوکری ضرور مل جائے گی ـــــ میرے ذہن میں بجلی کوندنے لگی۔

روپے کی کمی سے بابا کے علاج میں بھی کمی آتی گئی۔ بابا کے پیسے سے دوائیں خریدتا، یا سبھوں کا پیٹ بھرنے کے لئے چاول، دال خریدتا ـــــ بابا کی بیماری بڑھتی گئی ـــــ اور میں انتظار کرنے لگا۔ ایک غم کے بدلے ہزاروں خوشیاں ـــــ میری نظروں کے سامنے چاند تارے جگمگانے لگے ـــــ میری بیوی نئی نویلی دلہن کی طرح سجی سنوری نظر آنے لگی۔ اس کے زرد چہرے پر گلاب کھلنے لگے ـــــ میرا بیٹا نئی نئی پوشاکوں میں ملبوس، ڈھیر ساری مٹھائیوں، ٹافیوں اور کھلونوں کے ساتھ کھیلتا نظر آنے لگا۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں...... میں خوشی سے جھوم اٹھا۔

پاس پڑوس کے لوگ بابا کو دیکھنے آتے اور دیکھ کر کہتے ـــــ اب ان کا بچنا مشکل ہے ـــــ یہ سن کر میں خوش ہوتا، لیکن ایک لمحہ کے لئے مجھے بڑا غصہ بھی آتا۔ کیوں میرے بابا کے بارے میں لوگ ایسی منحوس باتیں کہہ رہے ہیں۔ بھگوان نہ کرے میرے بابا کو کچھ ہو ـــــ لیکن دوسرے ہی لمحہ میری نظروں کے سامنے افلاس اور بے روزگاری کی چٹانوں سے ٹکراتا میرا مستقبل اور ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی خوشیاں رقص کرنے لگتیں۔ میرے اندر ایک چیخ اُبھرتی، جو اندر ہی اندر دم توڑ دیتی۔ میرے اندر ایک کشمکش جاری تھی۔ کبھی بابا کی گود میں میں کھلونے اور مٹھائیاں لئے خوش ہو رہا تھا اور کبھی میرا بیٹا راہل میری گود میں کھلونوں اور مٹھائیوں کے لئے بضد تھا۔ وہ مچل رہا تھا۔ پھر ایک آواز نے میری سوچ کے دائرہ کو سمیٹ لیا۔ بابا، اپنی نقاہت بھری آواز سے مجھے پکار رہے تھے۔ میں دوڑتا ہوا ان کے قریب گیا۔ رات ڈھل چکی تھی۔ ہر سمت خوفناک تاریکیوں کا راج تھا، کہیں قریب ہی کتّوں کے رونے کی صدا فضا کو مزید ہیبت ناک بنا رہی تھی ـــــ میری زرد رُو بیوی راہل کو اپنی آغوش میں لئے سو رہی تھی ـــــ میں بابا کے پلنگ کے قریب پہنچ گیا ـــــ وہ پانی مانگ رہے تھے، میں نے انھیں ہاتھ کا سہارا دے کر اٹھایا اور

پانی پلایا ـــــ پانی پی کر وہ لیٹ گئے ۔ میں ان کے قریب بیٹھا سوچتا رہا ۔ بابا کی بیماری کو کتنے ماہ ہوگئے ـــ نہ جیتے ہیں اور نہ .... یہ کالی ' بھیانک رات اتنی لمبی کیوں ہوتی ہے ؟ صبح کا اُجالا پھیلنے میں اتنی تاخیر کیوں ـــــ میں بابا کے اور قریب ہوگیا ـــــ اور ...... اور پھر نہ جانے کیا ہوا کہ میرے ہاتھ آہستہ آہستہ بابا کی نحیف گردن کی طرف بڑھنے لگے اور پھر میرے دونوں ہاتھوں کا دباؤ بابا کی گردن پر بڑھنے لگا ـــ اچانک ایک لمحہ کے لئے میرے ہاتھ رُک گئے ۔ ذہن میں ایک خیال نے سر اُبھارا ' یہ میں کیا کر رہا ہوں ؟ لیکن دوسرے ہی لمحہ میرے سوچنے کی صلاحیت ختم ہوگئی اور میرے ہاتھوں کا دباؤ بابا کی گردن پر مزید بڑھ گیا ۔ ایک ساعت کے لئے بابا کی آنکھیں کھلیں اور .... اور پھر وہ آنکھیں بے جان ہوگئیں ۔ میں ان بے جان آنکھوں کو دیکھ کر چیخ پڑا ۔ چیخ سن کر قریب ہی سوئی ہوئی میری بیوی جاگ گئی ۔ وہ دوڑتی ہوئی آئی اور بابا کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ بھی چیخ پڑی ـــــ بابا ..... بابا ..... وہ زار و قطار رونے لگی ۔ اس کے رونے کی آواز سن کر پڑوسی جاگ گئے ۔ پھر لوگوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہوا ـــ آخر بیماری نے جان لے ہی لی ـــ پڑوسی آپس میں باتیں کر رہے تھے اور میں ـــــ میں پتھر کی مورت بن گیا تھا ۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ باپ کی موت نے مجھے گہرا صدمہ پہنچایا ہے ـــ

دوسرے دن بابا کا انتم سنسکار کر دیا گیا اور کچھ دنوں بعد مجھے بابا کی جگہ پر کارخانہ میں نوکری مل گئی ـــ نوکری کا پروانہ لئے میں دوڑتا ہوا گھر آیا ' مجھے لگا جیسے میرے گھر کے چاروں طرف روشنی ہی روشنی جگمگا رہی ہے ' خوشیاں ہی خوشیاں رقص کر رہی ہیں ـــ مجھے بے حد خوش دیکھ کر میرا بیٹا راہل اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر میری گود میں آنا چاہ رہا تھا ۔ لیکن ـــــ اچانک نہ جانے کیوں راہل کے بڑھے ہاتھ دیکھ کر میں کانپ گیا ۔ ان ہاتھوں سے مجھے خوف محسوس ہونے لگا ـــ کہیں ـــــ یہ ہاتھ ـــ کبھی میرے ہاتھ نہ بن جائیں ۔ ؟

خلیج

انور گھر اور گھر سے باہر کی ہر چھوٹی بڑی باتوں کو وہ بڑی شدّت سے محسوس کرتا۔ والد کی محدود آمدنی کی وجہ کر تعلیم حاصل کرنے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی وہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ اور گھر کا ذمہ دار فرد ہونے کی وجہ سے گھر کی معاشی مجبوریوں کو سمجھتے ہوئے ایک موٹر گیراج میں کام پکڑلیا!

بچپن میں اس نے بھی خواب دیکھے تھے، رنگ برنگے خوشنما خواب — لیکن وہ خواب — خواب ہی رہے، شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے۔ اس نے سوچا تھا میں بڑا ہوکر بڑا آفیسر بنوں گا۔ پہلی تنخواہ، جو ڈھیر سارے روپئے کی شکل میں ہوگی، ماں کے آنچل میں ڈال دوں گا۔ ماں اس دن کتنا خوش ہوگی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو ہوں گے۔ محکمہ کی جانب سے ملنے والی گاڑی پر ماں کو اپنی بغل میں بٹھاؤں گا اور دور دور بہت دور سیر کراؤں گا۔ ماں کہے گی، بیٹا ذرا آہستہ گاڑی چلاؤ — لیکن میں تیز..... خوب تیز...... آندھی طوفان کی طرح گاڑی چلاؤں گا اور ایک شاندار ہوٹل کے سامنے گاڑی روکوں گا، ماں کو گدّے دار کرسی پر بٹھاؤں گا اور اس کے انکار کے باوجود ہر وہ چیز کھانے کو منگاؤں گا، جس کی خواہش ایک زمانے سے ماں کے دل میں بسی ہے۔ ماں کو اتنے سکھ..... اتنے آرام دوں گا کہ وہ ماضی کی ساری تکلیفوں

کو بھول جائے گی ـــ لیکن یہ سب کچھ نہیں ہوا ـــ موٹر گیراج سے ملنے والی پہلی تنخواہ کی رقم اتنی کم تھی کہ ماں کے سامنے دیتے ہوئے اسے خفت محسوس ہوئی ' وہ سوچ رہا تھا کہیں ' ماں ' یہ نہ کہہ دے ـــ " بیٹا ' تو نے یہی خواب دیکھے تھے ۔؟ "

اسی دوران والد ' بڑا بابو ہو کر ریٹائر ہو گئے ۔ محدود آمدنی مزید محدود ہو گئی ' پپّو اور بے بی کی فکر میں ماں ' باپ دونوں پریشان رہنے لگے ' اور ان کی پریشانی کو دیکھ کر وہ والدین کو سمجھاتا ' " آپ لوگ کیوں پریشان ہوتے ہیں ۔ میں ہوں نہ "۔

انور کی بات سن کر ماں اس کے گال تھپتھپا دیتی جیسے وہ کہہ رہی ہو ' اب تم ہی ہمارا آسرا ہو ۔

اور انور نے جو خواب اپنے لئے دیکھے تھے ' وہ اب اپنے چھوٹے بھائی پپّو کے لئے دیکھنے لگا ـــ پپّو اس کی کوششوں سے خوب پڑھے لکھے گا ' بڑا آفیسر بنے گا ' سارے شہر میں اس کی خوب عزّت اور رعب ہوگا اور اس کی عزّت اور رعب سے لوگ میری بھی عزّت کریں گے ۔ اسے سرکاری گاڑی ملے گی ۔ وہ اصرار کر کے مجھے اپنے ساتھ گھومنے لے جائے گا ۔ اگر کبھی میں انکار کروں گا تو کہے گا ۔ " بھیا آپ نہیں جائیں گے تو میں بھی نہیں جاؤں گا ۔ اور اتنے میں ماں آجائے گی اور کہے گی ۔ پپّو اتنا ضد کر رہا ہے تو جاؤ نہ ' ساتھ میں گھوم آؤ اور میں اس کی بغل والی سیٹ پر بیٹھ جاؤں گا ' پپّو گاڑی اسٹارٹ کرے گا اور زوں سے گاڑی آگے بڑھے گی ۔ اور پھر راستے بھر خوشیاں ہی خوشیاں .....

انور ' پپّو کی پڑھائی لکھائی کے لئے ہر ممکن تگ و دو کرنے لگا ۔ بے بی کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر بھی اسے ستائے رہتی ۔ ادھر گیراج کا مالک اس کی تنخواہ میں اضافہ کرنے پر رضامند نہیں تھا ۔ اور خرچ بڑھتا ہی جا رہا تھا ۔ آخر ایک دن اس نے گیراج کا کام چھوڑ دیا اور اپنے ایک دوست سے موٹر ڈرائیوری سیکھنے لگا اور بہت جلد وہ ایک ماہر ڈرائیور ہو گیا اور ایک سرکاری محکمہ میں اسے ڈرائیور کی نوکری بھی مل گئی ۔ پہلے دن جب وہ مجسٹریٹ صاحب کی کار

کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو اسے کچھ عجیب سا لگا۔ وہ سوچنے لگا' اس نے جو خواب دیکھے تھے' وہ کتنے برعکس روپ میں آج اس کے سامنے ہے۔ اس نے ایک سرد آہ بھری اور اگنیشن میں چابی گھما کر گاڑی اسٹارٹ کردی' ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھاتے اور کلچ چھوڑتے ہی کارزوں سے آگے بڑھی اور پھر ہوا سے باتیں کرنے لگی ـــ پچھلی سیٹ پر سوٹ ٹائی میں ملبوس مجسٹریٹ صاحب تشریف فرما تھے۔ ان کی سگریٹ کے دھوئیں ونڈ اسکرین سے ٹکرار ہے تھے۔ انور کے تصوّر میں مجسٹریٹ صاحب کی شکل میں اس کے چھوٹے بھائی پپّو کی شبیہہ ابھرنے لگی۔ کتنا ہینڈسم اور اسمارٹ لگے گا میرا پپّو' جب سوٹ ٹائی میں ملبوس شان سے وہ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے گا اور اپنے ڈرائیور کو حکم دے گا ـ" آفس چلو۔" اور راستے میں پپّو نے اگر مجھے کہیں دیکھ لیا تو وہ فوراً گاڑی رکوائے گا اور کہے گا ـ" بھیا' کہاں جارہے ہیں' آئیے میرے ساتھ۔" اور میں بھی ایک شان سے پپّو کے ساتھ بیٹھ جاؤں گا.....

اچانک پٹرول پمپ آگیا۔ اس نے نیچے اتر کر کار کی ٹنکی فل کرائی اور گاڑی پھر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ ٹاپ گیر دیتے ہی اس کی سوچ کا زاویہ بدل جاتا ہے۔ اس نے جب آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا تو اپنے دادا اور ان کے چھوٹے بھائی کے درمیان ایک لمبی خلیج دیکھی۔ دونوں بھائی ایک ہی محلے میں چند قدم کے فاصلے پر رہتے' لیکن دل کے اعتبار سے دونوں دور بہت دور تھے۔ دونوں کے درمیان کی خلیج بڑھتی گئی اور ایک وقت وہ بھی آیا' جب دونوں آمنے سامنے سے کسی اجنبی کی طرح گزر جاتے ـــ بڑھتی ہوئی خلیج کو کسی نے پاٹنے کی کوشش نہیں کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں بھائیوں کے بیٹوں کے درمیان بھی خلیج کی بنیاد پڑی اور دن بہ دن بڑھتی چلی گئی اور انور نے یہ بھی دیکھا کہ اس کے والد اور ان کے چھوٹے بھائی کے درمیان خونی رشتہ بس نام کا ہے۔ کسی تقریب یا تعزیت کے موقعہ پر خونی رشتے کا احساس جاگتا اور اس کے بعد پھر وہی خلیج! یہ سب دیکھ کر اس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس روایت کو توڑ دے گا اور ایک نہ ایک دن وہ اس خلیج کو پاٹ کر رہے گا۔

پپّو سے انور کی بے انتہا محبت اور خیال کے پیچھے ایک وجہ یہ بھی تھی ۔ وہ پھر کسی خلیج کو جنم دینا نہیں چاہتا تھا ۔

خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ گاڑی آفس میں داخل ہو رہی تھی ۔ انور نے بریک لگائے اور بڑھکر مجسٹریٹ صاحب کے لئے کار کا دروازہ کھولنے لگا ۔

انور ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو تنخواہ ملنے کے بعد اپنے گھر کے تمام لوگوں کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور خریدتا، ان میں پپّو اور بے بی کی فرمائشوں کے سامان بھی ہوتے ۔ اور ایسا کر کے وہ دل ہی دل میں ایک انجانی سی خوشی محسوس کرتا ۔ اس کے دوست کہتے ۔ ارے یار، تو اتنا کماتا ہے پھر بھی ہمیشہ پھٹے حال ہی رہتا ہے اور جواب میں وہ خاموش رہتا ۔ اس لئے کہ اسے احساس تھا کہ اگر اس نے اپنے لئے نئے کپڑے بنوائے تو پپّو کو خیال ہوگا کہ میں ابھی کماتا نہیں اس لئے میرے پاس اچھے کپڑے نہیں ہیں ۔ انور جب بھی کپڑے بنواتا، سبھوں کے لئے ایک ساتھ ۔ تاکہ کوئی احساس کمتری کا شکار نہ ہو ۔ اس کے احساسات و جذبات کو اس کے ماں باپ بڑی اچھی طرح سمجھتے تھے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے ! یہی وجہ تھی کہ اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی پورے گھر میں رونق سی آجاتی ۔ ماں، بے بی ہر طرح اس کے آرام کا خیال رکھتیں ۔ پپّو بھی ان کا بے حد خیال رکھتا ۔

دن گزرتے گئے اور انور کی کوششوں سے پپّو نے بی ۔ اے کر لیا اور ایک دن انور کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب پپّو نے مقابلے کا امتحان بھی اچھی پوزیشن سے پاس کر لیا اور انکم ٹیکس آفیسر ہو گیا ۔

پپّو کی اس ملازمت کے ساتھ ہی گھر کے ہر کونے سے سُکھ چین اور آسائشیں جھانکنے لگیں ۔ کمروں اور برآمدوں کی خالی جگہ بھرنے لگیں ۔ ٹی ۔ وی، فریج، ڈریسنگ ٹیبل، الماری، گدّے دار مسہری، ڈائننگ ٹیبل، صوفہ سیٹ، گیس چولھا ــــ پورے اداس گھر کا نظام بدل گیا ۔

لیکن ایک بات یہ ہوئی کہ ــــ انور کے گھر میں داخل ہوتے ہی جو خوشیاں مسکراتی تھیں، اب ان خوشیوں کا مرکز پپّو ہو گیا تھا ۔ ماں اور بے بی، جس انور کے گھر میں داخل ہوتے ہی اس کے

اور محبت اور پیار نچھاور کرتی تھیں۔ اس محبت اور پیار کو سرد ہوا جیسے اڑا لے گئی ـــــ انور کبھی دو چار گھنٹے تاخیر سے آتا تو گھر کا ہر فرد پریشان ہوجاتا۔ اور اس کے آتے ہی ـ "انور اتنی دیر کہاں رہ گئے تھے۔ بھیا کیوں اتنی دیر باہر رہتے ہو، کب سے کھانے پر تمہارا انتظار ہورہا ہے اور وہ اپنی مجبوریاں بتاتا ہوا سبھوں کے ساتھ کھانے پر بیٹھ جاتا ـ لیکن اب انور کا کوئی انتظار نہیں کرتا، ہاں پپّو کبھی آدھا گھنٹہ بھی دیر سے آتا، تو فون پر فون کئے جاتے ـ انور، یہ سب دیکھتا، محسوس کرتا اور خاموش رہتا، دل کو سمجھانے کی کوشش کرتا، لیکن اس میں وہ کامیاب نہیں ہوتا۔

ایک دن وہ بھی آیا، جب پپّو، نئی چمچماتی سرخ رنگ کی کار لے کر گھر آیا۔ سارے لوگ دوڑ پڑے ـ انور بھی ساتھ تھا ـ دوڑ کر پپّو کو گلے لگالیا، اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لرز رہے تھے۔ مبارک ہو پپّو ـ ماں، باپ، بے بی سبھی بے حد خوش تھے۔ انور خوشی سے بے قابو ہوکر کار میں بیٹھ گیا۔ اگنیشن میں چابی لگی ہوئی تھی۔ اس نے اسٹارٹ کیا اور زوں سے گاڑی آگے بڑھی ـــــ انور آج بے حد خوش تھا ـ اس کے دیکھے ہوئے خواب سچ ہو رہے تھے۔

انور نے اپنے تمام دوستوں کو فخریہ کار دکھائی، اس انداز سے، جیسے یہ کار پپّو نے نہیں خود اس نے خریدی ہے۔ فخر اور خوشی سے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ دوستوں نے انور سے کہا ـــــ "ارے یار، کبھی ہم لوگوں کو بھی گھماؤ، تب نہ سمجھوں"۔ انور نے جھٹ کہا۔ "یہ کون سی بڑی بات ہے۔ کل سنڈے ہے، ۹ بجے تم لوگ تیار رہنا ہم سب رام گڑھ گھومنے چلیں گے۔"

دوسرے دن انور نے سویرے ہی ناشتہ کیا اور اپنے سب سے اچھے کپڑے پہن کر باہر جانے کو تیار ہوا۔ پپّو کے کمرے کے اندر ٹیبل پر رکھی کار کی چابی اٹھائی اور باہر نکل کر کار اسٹارٹ کرکے گیراج سے نکالی ہی تھی کہ اس نے دیکھا، اندر سے پپّو بڑی تیزی سے اس کی طرف آرہا ہے۔ اور آتے ہی اس نے سوال کیا ـــــ "کہاں چلے بھیا۔؟"

"ارے دوستوں کا بہت اصرار ہے، اس کار میں گھومنے کا۔ اس لئے آج ہم لوگ رام گڑھ

جا رہے ہیں، شام تک لوٹ آئیں گے۔" یہ کہتے ہوئے انور اکسیلیٹر پر دباؤ ڈال کر گاڑی آگے بڑھانے لگا، گاڑی ابھی چند قدم آگے ہی بڑھی تھی کہ ہتّو نے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی کو روکنے کا اشارہ کیا۔ انور نے گاڑی روک کر استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا، اس نے سوچا شاید ہتّو کہے گا، میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ گھومنے چلوں گا۔ لیکن ــ نہیں ــ ہتّو کے چہرے اور آنکھوں میں برف کی سی سختی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"سنئے، یہ کوئی آپ کے صاحب کی سرکاری گاڑی نہیں ہے۔ جو........!"

اس جملے کے بعد ہتّو نے کیا کہا، انور سن کر بھی نہ سن سکا، اس کے کان جھنجھنا اُٹھے۔ چہرے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئیں۔ اس کے دل میں درد کی شدید لہر اُٹھی۔

بے جان ہاتھوں سے اس نے گاڑی کا انجن بند کیا، آہستگی سے کار کا دروازہ کھولا، چابی ہتّو کے ہاتھ میں دی اور اپنے کمرے میں آکر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

دوسرے کمرے سے ماں کی آواز آ رہی تھی۔ "ارے اس ڈریسنگ ٹیبل کے آئینہ پر بال کیسے آگیا؟"

عزّت دار

"اِس لڑکے نے تو ہم لوگوں کا جینا دوبھر کر دیا ہے، کمبخت پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مرگیا، ایسی اولاد سے تو اچھا تھا کہ بے اولاد ہی رہتی، خاندان کی ناک کٹوادی ہے، اس منحوس......"

اختر میاں جیسے ہی گھر میں داخل ہوئے، انھیں اپنی بیگم کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی، وہ سمجھ گئے کہ ضرور آج پھر صاحبزادے نے محلّے میں کوئی فتنہ برپا کیا ہے اور لوگ شکایت کے ساتھ ساتھ دو چار کھری کھوٹی اس کی ماں کو سنا گئے ہیں، ورنہ دھان پان سی نحیف ولاغر بیگم کی اتنی تیز آواز......

اختر میاں نے سب کچھ سمجھ کر اپنی سائیکل باہر کے برآمدے میں کھڑی کی اور گھر کے اندر داخل ہوئے۔ ان کے داخل ہوتے ہی بیگم کی آواز کو جیسے بریک لگ گیا اور صاحبزادے جو سر جھکائے کھڑے تھے، بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ایسا کیوں ہوا؟ اختر میاں، اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ صاحبزادے کے اس قدر بگڑنے کی ذمہ دار اس کی ماں ہی تھی۔ بے جا لاڈ پیار اور ہر شرارت پر ان کا یہ فرمانا کہ ابھی بچہ ہے، بڑا ہوگا تو ٹھیک ہو جائے گا، لیکن بچہ جیسے جیسے بڑا ہوا ویسے ویسے اس کی شرارت بھی بڑھتی گئی۔ اور اب تو وہ گھر میں کم، باہر ہی زیادہ شرارت کر رہے تھے۔ شرارت نہیں، شرارت تو

معصوم بچے کیا کرتے ہیں۔ اب وہ آوارہ گردی اور غنڈہ گردی پر اُتر آئے تھے۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہوگا، جس دن اس کی شکایت کرنے، دھمکی دینے اور بُرا بھلا کہنے محلّے کے لوگ نہ آتے۔ اکلوتا بیٹا جو ٹھہرے ...... ماں کے ساتھ ساتھ اختر میاں کی بھی شدید خواہش تھی کہ بیٹا خوب پڑھے لکھے۔ بڑا آدمی بنے، نام کمائے۔ لیکن یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ پڑھائی سے وہ ہمیشہ دور دور ہی رہے۔ جب کبھی اختر میاں سختی کرتے یا بازپُرس کرتے تو ماں دوڑی آتیں۔ کیوں آپ سزا دے رہے ہیں، ابھی بچہ ہے، بڑا ہوگا تو...... اور بڑا ہو کر اس نے اس طرح نام روشن کیا۔ کہ آئے دن محلے والوں کی کھری کھوٹی باتیں اور گالیاں سننے کو مل رہی تھیں۔

اختر میاں خاموشی سے اپنے کمرے میں ایسے داخل ہو گئے، جیسے انھوں نے کچھ سنا ہی نہ ہو اور جا کر اپنے بستر پر ڈھیر ہو گئے۔ دن بھر کی تھکان، پرائیوٹ فرم کی کلرکی کسی کولھو کے بیل کی طرح ہوتی ہے۔ بدن کی رگ رگ سے خون نچوڑنے کے بعد ہی وہ پہلی تاریخ کو ایک ہزار روپئے یوں ہتھیلی پر رکھتے جیسے سارے زمانے کی خوشیاں انہیں سونپ رہے ہوں۔ اس مہنگائی کے دور میں، ایک ہزار روپے ایسے غائب ہو جاتے جیسے گرم توے پر پانی کا ایک قطرہ..... اور پھر پورا مہینہ بک بک جھک جھک، ٹینشن، ہنگامہ ...... کبھی بیوی سے جھڑپ، کبھی بیٹے کو پھٹکار کبھی اکلوتی بیٹی پر غصّہ اور کبھی ...... جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اختر میاں کی صحت جواب دے رہی تھی۔ چالیس سال کی عمر میں ہی وہ ساٹھ پینسٹھ برس کے لگنے لگے تھے۔ لاغر، نحیف جسم، گالوں پر جھریاں، سفید بال۔ کون کہہ سکتا تھا کہ کبھی اختر میاں بھی ایسے خوبرو نوجوان تھے کہ کئی حسین لڑکیاں ان پر جان نچھاور کرنے کو تیار رہتی تھیں۔ لیکن ظالم وقت اور حالات نے انھیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ اختر میاں نے بی۔اے میں داخلہ لیا ہی تھا کہ اچانک والد چل بسے اور اپنے ساتھ گھر کی خوشیاں بھی لیتے گئے۔ اور ان کے دیکھے ہوئے سارے خواب ریزہ ریزہ ہو کر ان کے پورے وجود کو لہو لہان کر گئے، اور وہ ایک ایک ریزہ کو اپنے لہولہان جسم سے نکالنے میں منہمک ہو گئے، کہ بدن سے رِستے ہوئے خون بند

ہو جائیں تو وہ پھر خوشیوں کو سمیٹنے میں لگ جائیں اور خوشیوں کو اپنی مٹھیوں میں قید کرلیں، لیکن خوشیاں ان کی مٹھیوں میں ریت کی طرح پھسل جاتیں۔ خوشیاں سمیٹنے میں وہ جب ناکام رہے تو وہ خود کو سمیٹنے کی کوشش کرنے لگے، ویسے بھی خاندان کے لوگ ان کی غربت اور مفلسی دیکھ کر کنارہ کش ہوتے گئے۔ اس لئے اختر میاں مزید سمٹ کر رہ گئے۔ میاں بیوی، ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔ شادی کے بعد پہلی بیٹی پیدا ہوئی تھی جس کی خبر سن کر وہ بے اختیار کراہ اُٹھے تھے۔ ان کی نظروں کے سامنے جوان بیٹی کا دُکھ جھیلتے والدین کے سوکھے اور زرد چہرے گھومنے لگے تھے۔ بَر کی تلاش اور جہیز کی لمبی فہرست وہ کہاں سے پورا کرسکیں گے۔ لیکن انھوں نے ذہن کو جھٹک دیا تھا کہ ابھی بہت دیر ہے، ابھی سے اس فکر کا سایہ اس معصوم بچی پر کیوں پڑنے دوں اور یہ سوچ کر وہ آگے بڑھے تھے اور بے اختیار بچی کو گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگے تھے ـــــ ہاں بیٹے کی پیدائش پر وہ بے حد خوش ہوئے تھے اور اپنے دفتر سے قرض لے کر مٹھائیاں تقسیم کی تھیں۔ انھیں یقین تھا کہ میرا یہ بیٹا برسوں سے پڑے اداس اور خاموش گھر کے چاروں طرف خوشیوں کے چراغ روشن کردے گا اور میرا یہ سونا سونا بے جان سا گھر جگ مگ جگ مگ کر اُٹھے گا۔ بیٹا بڑا آدمی بنے گا۔ بڑی شان و شوکت ہوگی۔ بڑے بڑے لوگ آئیں گے اور...... اور ......

لیکن قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ اختر میاں نے اپنی اوقات سے کہیں زیادہ بیٹے کی فرمائشوں اور خواہشوں کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ خود تکلیف اٹھائی۔ مگر بیٹے کو احساس محرومی کا شکار نہ ہونے دیا۔ ماں نے بھی بیٹے کے ہر مطالبہ کو پورا کرنے کی کوشش کی، لیکن ......

اس کا جو نتیجہ سامنے آیا وہ یقینی طور پر بے حد حوصلہ شکن تھا۔ بُرائی کی طرف بڑھتے بیٹے کے قدم سے اختر میاں اور اس کی بیگم ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگے۔ ماں نے پہلے ہی سپر ڈال دی تھی اور اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے ایک دن کہہ دیا تھا کہ بے شک یہ اسی کے لاڈ و پیار کا نتیجہ ہے کہ آج اس حال کو پہنچا، ورنہ کس کی مجال کہ کوئی گھر آکر بد زبانی کر جائے لیکن اب تو اپنے اس نالائق اولاد کی وجہ کر گالیاں بھی سننا پڑ رہی ہیں۔ ایسی ذلت اور رسوائی کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

اختر میاں اپنے بستر پر لیٹے لیٹے انھیں خیالات میں گُم تھے کہ بیگم نے چائے لاکر دی۔ اُن کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت روئی ہیں، ان کا اداس اور غمگین چہرہ دیکھ کر وہ اپنے غصہ کو پی گئے۔ کہ اندر ہی اندر ٹوٹی اور بکھری ہوئی اس عورت سے کیا شکوہ شکایت اور غصّہ کروں۔ اختر میاں نے انھیں اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا، لیکن ابھی وہ ان کے قریب ٹھیک سے بیٹھ بھی نہیں پائی تھیں کہ اچانک باہر دروازے پر دستک ہونے لگی۔ چائے کی پیالی بستر پر چھوڑ کر اختر میاں باہر دروازے کی جانب دوڑے اور دروازہ کھول دیا.... باہر پولیس کھڑی تھی۔ ساتھ میں محلّے کے کچھ لوگ بھی تھے۔ دروازہ کھول کر اختر میاں ابھی پوری بات سمجھ بھی نہیں پائے تھے کہ پولیس انھیں ایک طرف دھکا دیتی ہوئی گھر کے اندر داخل ہوگئی۔ اختر میاں چیخنے لگے یہ کیا بدتمیزی ہے، یہ کیا بے ہودگی ہے۔ کس کے حکم سے آپ لوگ میرے گھر میں داخل ہو رہے ہیں، کون سا وارنٹ ہے آپ کے پاس۔ لیکن پولیس والوں نے ایک نہ سنی اور دھڑ دھڑاتے ہوئے گھر میں داخل ہوگئے۔ اختر میاں نے پلٹ کر دیکھا، پولیس ارشد کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی اور بیگم برآمدہ کے ایک پایہ کے سہارے بُت بنی کھڑی تھیں۔ ان کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیلی ہوئی تھیں اور چہرہ بالکل زرد تھا اور پھر انہوں نے دیکھا کہ پولیس ارشد کو پکڑے لیے جا رہی ہے، تو وہ چیخ پڑیں۔ "نہیں نہیں، چھوڑ دو میرے بیٹے کو۔ اب یہ غلطی نہیں کرے گا، میں اس کا وعدہ کرتی ہوں۔ اس کی جو سزا ہو وہ مجھے دے دو"۔ لیکن پولیس والوں نے ایک نہ سُنی۔ اختر میاں تو جیسے پتھر کے مجسمہ میں تبدیل ہوگئے تھے۔ پولیس والے بھدّی بھدّی گالیاں دیتے ہوئے۔ "سالا داداگیری کرتا ہے، سردار بنا ہے موالیوں کا، محلّے والوں کا جینا حرام کر دیا ہے، اب سالے چل تجھے جیل میں سڑا دوں گا...." اور پولیس والے بڑی بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے ارشد کو گرفتار کرکے لے گئے۔

سارے خواب، سارے ارمان چکنا چور ہو گئے، کیا کیا خواب تھے لیکن ......

ارشد کو دو سال کی قید ہوگئی۔ یہ خبر سن کر اختر میاں اور ان کی بیگم ایک آہ سرد بھر کر رہ گئے۔

بس خاموشی سے دونوں ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ انھوں نے سوچا ارشد کے جیل جانے کے بعد شکوہ شکایت کا سلسلہ، روز روز کے ہنگامے اور گالی گلوچ کا سلسلہ ختم ہوجائے گا اور سکون کی زندگی گذرے گی۔ لیکن ان کا یہ سوچنا غلط ثابت ہوا، محلے والوں نے جو رویہ اپنایا تھا وہ پہلے سے بھی زیادہ ہتک آمیز اور غیرت کو للکارنے والا تھا۔ لوگ اب گھر پر آکر برا بھلا نہیں کہتے لیکن گھر سے نکلنے پر ایسی ایسی آوازیں کستے کہ ان کا سر شرم سے جھک جاتا، ایک دن انھوں نے صاف صاف سنا تھا "سالا بڑا شریف بنتا ہے، بیٹے کو ٹریننگ دی ہوگی، تبھی تو بیٹا ایسا نکلا۔ گھر میں آمدنی کیسے بڑھتی۔ پڑھایا لکھایا نہیں تو چور، ڈاکو اور قاتل ہی بنے گا نہ......"

اختر میاں یہ سن کر بڑی تیزی سے سائیکل کا پیڈل مارتے ہوئے دفتر کی جانب بھاگے تھے۔

وہ اس واقعہ کو بھی پی گئے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا لیکن ایک دن تو انتہا ہوگئی۔ انھیں ایسی امید نہ تھی کہ محلے والے اتنا گر سکتے ہیں۔ دفتر سے شام کے وقت جب گھر پہنچے تو ان کی بیگم نے روتے ہوئے بتایا کہ آج محلّے والوں نے نکڑ پر کالج سے لوٹتی ہوئی بیٹی پر گندے گندے جملے پھینکے ہیں اور کہا ہے کہ شریفوں کے محلّے میں یہ لوگ رہنے کے قابل نہیں ہیں....."۔

اختر میاں پوری بات سنے بغیر ہی غصّہ سے آگ بگولا ہوگئے۔ وہ چیختے ہوئے دروازے کی جانب بڑھے۔ "آج میں ان لوگوں کو دیکھ لوں گا، بہت برداشت کر رہا ہوں۔ قصور میرے بیٹے کا ہے، لیکن اس کی سزا ہم لوگوں کو کیوں؟ اور پھر وہ تو اپنے کئے کی سزا بھگت ہی رہا ہے۔"

ابھی وہ باہر برآمدے تک ہی پہنچے تھے کہ ان کی بیگم اور بیٹی روتی ہوئی ان کی جانب بڑھیں اور انھیں دبوچ لیا۔ چھوڑیئے جانے دیجئے، بات مت بڑھائیے۔ ہم لوگ ان کے سامنے کمزور ہیں، وہ لوگ ایک ہو رہے ہیں....." بڑی مشکل سے اختر میاں قابو میں آئے اور ہانپتے ہوئے نڈھال ہوکر بستر پر گر گئے۔

بستر پر لیٹے لیٹے ایک بات ان کے ذہن میں آئی کہ بیٹی اب جوان ہوگئی ہے۔ اس کے ہاتھ پیلے کرکے جلد از جلد رخصت کر دیا جائے، ورنہ نہ جانے اور کتنی ذلتوں اور رسوائیوں کا سامنا

کرنا پڑے گا ۔ یہ بات ان کے ذہن میں گھر کر گئی ۔ اور وہ بیٹی کا رشتہ ڈھونڈ نے لگے ۔ لیکن اس زمانے میں بیٹی کا رشتہ ڈھونڈنا سمندر سے موتی نکالنے سے زیادہ مشکل کام ہے ۔ کئی دروازے کھٹکھٹائے منّت سماجت کی، کبھی بات آگے بڑھی بھی تو جہیز کی لمبی فہرست نے ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا اور پھر وہی خلاء کہیں کچھ نہیں، سب کچھ سونا سونا اداس اداس ۔

اسی بھاگ دوڑ میں دو سال گزر گئے اور ایک دن ارشد جیل سے رہا ہو کر گھر آگیا، اختر میاں نے اسے دیکھا اور دیکھ کر منہ پھیر لیا ۔ ماں اور بہن دوڑ کر اس سے لپٹ گئیں ۔ اختر میاں کا بھی دل چاہا کہ اپنے بیٹے کو گلے لگالیں لیکن اتنی کڑواہٹوں نے جنم لے لیا تھا کہ وہ ایسا چاہ کر بھی نہ کر سکے ۔ اور اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے ۔ ارشد نے ایک نظر ان پر ڈالی اور پھر سر جھکا لیا ۔

ارشد کی جیل سے واپسی نے اختر میاں کو بڑے تذبذب میں ڈال دیا، ایک طرف اولاد کی محبت اور دوسری جانب اس کی وجہ سے ذلّت اور رسوائیوں کی چبھن ۔ وہ کیا کریں، کیا نہ کریں سمجھ میں نہیں آرہا تھا ۔ بیوی کی گرتی ہوئی صحت اور بیٹے سے اس کے والہانہ لگاؤ نے ان کی زبان پر تالے ڈال دئے تھے ۔ وہ بیٹے کے خلاف کچھ بول سکتے تھے نہ کوئی سخت قدم اُٹھا سکتے تھے ۔ اس گھر میں اس کا رہنا انھیں گراں گزر رہا تھا، آخر کار ایک دن انہوں نے ایک فیصلہ کیا کہ وہ اس کے کسی بھی معاملے میں دخل نہ دیں گے ۔ اب وہ کوئی بچّہ نہیں ہے کہ اسے سمجھایا جائے ۔ بائیس سال کا اچھا خاصا نوجوان ہے ۔ اسے خود اتنی عقل سمجھ ہونی چاہئے کہ وہ اچھے بُرے کی تمیز کر سکے ۔

وقت گزرتا رہا ۔ ارشد کو گھر آئے کئی ماہ ہو گئے، لیکن کہیں سے بھی کوئی شکایت نہیں، کوئی ذلّت آمیز جملے نہیں، اختر میاں کو لگا کہ جیل کی واپسی کے بعد ارشد میں تبدیلی آگئی، شاید اب وہ سدھر گیا ہے ۔ شاید...... شاید...... تبھی تو نکڑ پر کھڑے لوگ انھیں دیکھ کر جملے کسنے کے بجائے، سلام کرنے لگے ہیں ۔ سائیکل دیکھتے ہی جو لوگ راستے سے ہٹتے نہیں تھے، وہ اب ان کے لئے راستہ چھوڑ دیتے ہیں ۔ یہ سب اختر میاں کو بڑا اچھا لگنے لگا ۔ اب تو ان کے گھر میں بھی رونق رہنے لگی ہے ۔ ہر کمرے میں بلب کے ساتھ ساتھ ٹیوب لائٹس لگ گئی ہے ۔

باہر کے برآمدے کو گھیر کر ڈرائنگ روم بنا دیا گیا ہے اور اس میں صوفہ اور چند کرسیاں بھی سلیقے سے رکھ دی گئی ہیں۔ کھانا بھی عمدہ بننے لگا ہے۔ ایک دن رنگین ٹی۔وی بھی گھر میں نظر آئی۔ دفتر سے واپس آتے تو گھر کے باہر کئی اسکوٹر اور کاریں کھڑی ملتیں۔ اور اندر داخل ہوتے تو دیکھتے کہ ڈرائنگ روم میں دیدہ زیب لباسوں میں ملبوس لوگ ارشد سے محو گفتگو ہیں۔ کبھی کبھی ایک انجانا سا خوف ذہن میں ابھرتا' یہ سب کہاں سے اور کیسے؟ اور آخر ایک دن انہوں نے اپنی بیگم سے پوچھ ہی لیا' جس کے جواب میں بیگم نے کہا۔۔۔

"آپ بہت شکی ہیں' معلوم نہیں' ارشد نے اچھا سا بزنس شروع کیا ہے' آپ کو اپنے بیٹے کی پرواہ ہی کب رہتی ہے جو .... "

بیگم کا جواب سن کر اختر میاں خاموش ہو گئے۔ لیکن نہ جانے کیوں ذہن ان باتوں کو قبول نہیں کر رہا تھا' انھوں نے سر جھٹک دیئے کہ مجھے ان سب باتوں سے کیا لینا دینا۔ میں نے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ ہی دیا ہے۔ بس فکر ہے کہ کسی طرح سے بیٹی کی شادی ہو جاتی' اپنی زندگی تو کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائے گی۔ اور اچانک ایک دن اختر میاں کے گھر پر کچھ لوگ اس کی بیٹی کا رشتہ مانگنے آئے اور کہا" بس ہم صرف آپ کی اجازت چاہتے ہیں' بقیہ تمام باتیں ارشد بابو سے ہو چکی ہیں ۔۔۔" "ارشد بابو؟" اختر میاں کے ذہن کو جھٹکا لگا' وہ .... وہ... کون ہوتا ہے میرے معاملے میں دخل دینے والا' لیکن حقیقت سے کیسے آنکھیں چرائی جا سکتی تھیں چٹیل میدان میں دور دور تک کوئی سایہ دار درخت نہیں تھا' وہ خاموش رہے اور اچھا لڑکا' اچھے لوگ دیکھ کر حامی بھر لی۔

بیگم بھی بہت خوش ہوئیں۔ اور جب اختر میاں کو شادی کے اخراجات کے لئے پریشان دیکھا تو وہ ہنستے ہوئے بولیں ۔۔۔ " آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے' ارشد نے ساری ذمہ داری لے لی ہے۔"

دیکھتے دیکھتے پورا گھر جگ مگ جگ مگ کرنے لگا۔ بارات بھی آ گئی اور سارا

انتظام ایسا کہ اختر میاں کے خواب و خیال میں بھی نہ آیا تھا۔ مہمانوں کے آنے کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ وہ شامیانے کے ایک گیٹ پر کھڑے مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے کہ اچانک ایک جھلملاتی ہوئی لال بتّی والی سفید کار آ کر سامنے کھڑی ہوگئی۔ اس کار کے ٹھیک پیچھے پولیس فورس سے بھری ایک جیپ گاڑی تھی۔ اختر میاں کا دل دھڑکنے لگا، یہ کیا ہوا؟ کیا بات ہوگئی؟ لیکن ان کی ساری پریشانی پل بھر میں دور ہوگئی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ کار سے اتر کر ریاست کے ایک وزیر مسکراتے ہوئے، ارشد کے ساتھ ان کی طرف چلے آرہے ہیں۔ وزیر ان کے قریب آئے، ان کے گلے لگ گئے اور شادی کی مبارک باد دی اور آگے بڑھ کر معزز لوگوں کے درمیان جاکر بیٹھ گئے۔

اختر میاں سناٹے میں کھڑے تھے۔ میرا یہ بیٹا تو سچ مچ میری خوشیوں اور تمناؤں کا مرکز نکلا۔ میری یہ عزت، یہ وقار، یہ عظمت ..... میں تو کب کا یہ سب ذہن سے کھرچ کر نکال چکا تھا۔ لیکن میرے اس بیٹے نے تو .... دل چاہا دوڑ کر ارشد کو سینے سے لگالیں۔ لیکن وہ ایسا نہ کرسکے، نہ جانے کیوں، وہ کون سا کانٹا تھا، جو ایسے لمحوں میں گلے میں اٹک جاتا اور گلے کا پھانس بن جاتا۔ ان ہی ادھیڑ بن میں وہ ادھر اُدھر ٹہلنے لگے پھر ایک جگہ وہ کھڑے ہوگئے۔ یہاں پر مدھم روشنی تھی۔ کسی نے انھیں دیکھا نہیں۔ کچھ لوگ ارشد کے بارے میں گفتگو کررہے تھے۔ اختر میاں چونک پڑے اور بے اختیار اس جانب متوجہ ہوگئے کہ لوگ کیا بول رہے ہیں۔ حالانکہ باتیں کرنے والے سرگوشی میں باتیں کر رہے تھے مگر....

ایک کہہ رہا تھا۔"ان کا گھر تو بالکل بدل گیا، کیا شان و شوکت ہے، کیا ٹھاٹ باٹ ہے، شادی کا یہ انتظام ہی دیکھو نا؟"

جواب میں دوسرے نے دھیرے سے کہا۔"ہوگا کیوں نہیں، ارشد اس وقت شہر کا کوئی معمولی آدمی نہیں، وہ شہر کا سب سے بڑا ڈان ہے۔ اس کے ایک اشارے پر لوگ گردن اتار کر پیش کر دیتے ہیں۔"

اس آدمی کے یہ الفاظ کسی بم کے دھماکے کی طرح اختر میاں کے کانوں سے ٹکرائے، انھیں ایسا لگا جیسے یہ عزت، یہ وقار، یہ عظمت جگمگاتے قمقمے کی طرح کرایے کے ہیں۔ کسی بھی لمحہ، کسی بھی پل لوگ آئیں گے اور انھیں اُٹھالے جائیں گے اور پھر وہ ــــ ننگے، مادر زاد ننگے کھڑے رہ جائیں گے۔ ان کا سر چکرانے لگا، انھوں نے سنبھلنے کی کوشش کی، لیکن خود کو سنبھال نہ سکے اور شامیانے کے ایک بانس پر پورے بوجھ سے گر پڑے اور وہ بانس اُکھڑ گیا اور پھر ایک پر ایک بانس اُکھڑنے لگے اور طنابیں گرنے لگیں۔

آئینے کی گرد

میں اپنے بابا کے پرانے اور شکستہ مکان کو چھوڑ کر اپنے نئے مکان میں شفٹ کر گیا، جس کے ہر کمرے، برآمدے، کونے اور در و دیوار سے میری اعلیٰ رہائش اور دولت مندی کے ثبوت جھانک رہے ہیں۔ کیا نہیں ہے میرے اس نئے اور شاندار مکان میں؟ ہر وہ چیز جو غربت اور مفلسی کو شرمندہ اور میری شان و شوکت میں اضافہ کرے۔

اس مکان میں آکر میں بے حد خوش ہوں۔ مجھ سے زیادہ میری بیوی اور میرے بچے خوش ہیں — اس پرانے اور بوسیدہ مکان میں کیسا دَم گھٹتا تھا۔ ہر وقت ایک ہنگامہ ایک شور، ضرورت، مطالبہ.... اس مکان میں خود میں اپنی پہچان نہیں بنا سکا تھا —

بابا، پانچ سال ہوئے، ہیڈ کلرک کے عہدہ سے ریٹائر ہو کر گھر پر بیٹھ گئے۔ انھیں ملنے والی پنشن محدود — اور ضرورت کا پھیلتا ہوا منھ۔ روز روز کی بیماری — ڈاکٹر، دوا، کبھی یہ، کبھی وہ — میں عاجز آچکا تھا۔ میری بیوی کا ان کے مطالبوں پر جھنجھلا جانا بھی فطری تھا — بھیا ٹھہرے کالج کے پروفیسر، دن رات بس کتابوں کے ڈھیر میں ڈوبے رہنا۔ اور دانشوروں کے ساتھ بیٹھ کر دانشورانہ باتیں، ملکی اور غیر ملکی، سیاسی، سماجی اور معاشرتی انقلابات پر تبادلۂ خیال — اور آئے دن اخباروں اور رسالوں میں دانشورانہ خیالات سے مزین

ان کے مضامین کی اشاعت، جس کی گونج بہت دور تک سنائی دیتی، لیکن ان باتوں سے کہیں گھر کی مفلسی اور تنگدستی دور ہوئی ہے۔ بھیا، بین الاقوامی سیاسی، سماجی تبدیلیوں پر نظر رکھنے۔ لیکن گھر کے اندر رونما ہونے والی تبدیلیوں سے وہ بے خبر تھے شاید۔ اور مجھے جیسے ہی نوکری ملی وہ ساری چنتاؤں سے الگ ہو گئے۔ مجھے نوکری ملی تو کیا، میں اپنی خوشیوں کو اس طرح ختم کر دوں؟ ایک کمرے تک محدود اور قید کر دوں، جہاں بھیا کالج سے آنے کے بعد مقید رہتے ہیں۔ ان کے تین بچے، بھابھی، بابا، ماں، پھر میرا اپنا خاندان۔ آخر میں بھی تو انسان ہوں، میرے بھی سپنے ہیں۔ مانا کہ بچپن سے جوانی تک میری پڑھائی لکھائی، رہنے سہنے، کھانے پینے پر بھیا کی پوری توجہ رہی۔ مجھے نوکری دلاتے میں بھی اگر چالیس ہزار روپئے اپنے پی۔ ایف سے نکال کر نہ دیتے تو شاید پولیس سب انسپکٹر کی یہ نوکری بھی مجھے نہیں ملتی۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں اپنی ساری آمدنی ان لوگوں پر خرچ کر دوں؟ میں اپنے خوابوں میں رنگ بھرنا چاہتا تھا۔ اپنا گھر ہو، خوبصورت، سجا سجایا گھر، جہاں آرام و آسائش کا سارا سامان موجود ہو۔ ملنے والے آئیں تو میرا لیونگ اسٹینڈرڈ دیکھ کر غش غش کر اٹھیں، میری بیوی اور بچے احساس کمتری کے شکار نہ ہوں۔ اچھا اسکول، اچھا کپڑا اچھا کھانا اور اچھی رہائش ہی تو انسان کو بڑا اور باعزت بناتی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جس کسمپرسی کے عالم میں، میں نے زندگی گزاری ہے اور سو پچاس روپئے کے لئے بھی مجھے بابا اور بھیا کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑتا تھا، ان کا محتاج رہنا پڑتا تھا، وہ حالات میرے بچوں کو پیش آئیں۔

میرے پاس روپئے پیسے کی کمی نہیں ہے۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد بھیا کے لاکھ سمجھانے کے باوجود بھی میں نے کالج کی ملازمت کے بجائے پولیس کی نوکری کو ترجیح دی۔ اس لئے کہ میری نظروں کے سامنے ہی پروفیسر بھیا اور سب انسپکٹر رائے جی تھے۔ دونوں کی رہائش میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ انسان عقلمند وہی ہے جو اپنے ارد گرد کے حالات سے سبق سیکھے اور بھیا کے حالات یقینی طور پر میرے لئے سبق آموز تھے۔ اس لئے سب انسپکٹر پولیس کی نوکری پاکر میں بے حد مطمئن ہوں اور اسی نوکری نے آج مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ میرے سارے آدھے ادھورے

خواب سچ ہو گئے ۔ اس نوکری میں یہاں ہزار پندرہ سو روپے کی روزانہ آمدنی، کوئی خاص بات نہیں ہے اور ان ہی روپئے سے آج میرے گھر آنگن میں خوشیاں رقص کر رہی ہیں۔ میرے بچے مسرتوں کے جھولے میں جھول رہے ہیں، بیوی میری سکون آرام اور اطمینان کے سائے میں نرم نرم صوفے پر بیٹھ کر اپنی دوستوں کے ساتھ رنگین ٹی۔وی پر اپنی پسند کا کیسٹ لگا کر دیکھتی رہتی ہے۔ گھر کا کام نوکر دائیوں نے سنبھال لیا ہے۔ میری بیوی بس حکم چلاتی ہے۔ اور میں، میں تو صبح سے شام، شام سے رات گئے تک چوروں، ڈاکوؤں، قاتلوں اور مجرموں کے آگے پیچھے بھاگتا رہتا ہوں اور میری جیب لال، ہرے نوٹوں سے بھرتی رہتی ہے۔ ایسے لمحوں میں مجھے لگتا، میں اپنی جیب روپیوں سے نہیں، بلکہ آرام، سکون، اطمینان اور آسائشوں سے بھر رہا ہوں اور گھر جا کر اپنی پاکٹ سے نکال کر اپنے گھر کی پوری فضا میں بکھیر دوں گا، جس سے میرا گھر جگ مگ جگ مگ کر اٹھے گا۔

یوں تو مجھے فرصت ہی کم ملتی، لیکن جب کبھی تھوڑی بہت ملتی تو بیوی اور بچوں کے ساتھ آؤٹنگ کے لئے نکل جاتا۔ سیر سپاٹا اور پھر مہنگے ہوٹلوں میں کھانا بڑا اچھا لگتا ۔۔ کبھی کبھی میں اپنے بابا، ماں، بھیا، بھابی وغیرہ سے بھی ملنے جاتا، اور جب بھی جاتا، وہاں مجھے بڑی وحشت سی محسوس ہوتی ۔ پرانا بوسیدہ سا مکان۔ ہر طرف ادھڑی ہوئی در و دیوار۔ غربت اور مفلسی کی کی کہانی سناتی رہتی ۔ باہر کے کمرے میں بیٹھے بھیا سے بھی ملنے جاتا۔ ہمیشہ کی طرح دو چار پروفیسر اور ادیب و شاعر بیٹھے ملتے اور بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات پر تبصرہ چلتا رہتا ۔ بڑھتی ہوئی لاقانونیت، رشوت خوری اور ٹوٹتے ہوئے سماجی رشتوں سے نفرت اور بیزاری کا اظہار ۔۔ نہ جانے کیوں ان لوگوں کی یہ باتیں سن کر میں شاندار کپڑوں میں بھی خود کو ننگا محسوس کرنے لگتا ۔۔ لیکن جلد ہی ذہن کو جھٹک دیتا اور جی چاہتا کہ ان لوگوں کے سامنے چیخ چیخ کر کہوں ۔۔ آج کے زمانے میں ایمانداری کوئی فخر کرنے کی چیز نہیں رہ گئی ہے، دیکھئے اپنی حالت، دیکھئے اپنے گھروں کی حالت، ایمانداری کی پوجا کرنے والو ۔ کیا ملا ہے آپ لوگوں کو، سوائے غربت اور مفلسی کے ۔
لیکن میں چاہ کر بھی یہ باتیں نہیں کہہ پاتا ۔۔ اس لئے کہ بھیا کے پاس جو لوگ بھی بیٹھے تھے، وہ

زمانے کے لحاظ سے امیر نہیں تھے۔ لیکن ان کی باتیں، ان کی سوچ فکر اتنی بلندیوں پر تھیں جہاں میری نگاہیں نہیں پہنچ پاتیں ــ ان تمام لوگوں کا ذکر آئے دن کسی نہ کسی شکل میں ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات میں ضرور آتا ــــ گھر سے باہر لوگ انھیں بڑی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھتے ــــ کبھی کبھی خواہش ہوتی کہ میرا بھی نام ریڈیو، ٹی. وی اور اخباروں میں آئے اور میں اپنے دوستوں کو، اپنی بیوی بچوں کو فخریہ دکھاؤں اور سناؤں ــــ ایک بار میرا نام اخبار میں شائع بھی ہوا تھا۔ لیکن وہ اخبار میں لوگوں کو فخریہ دکھانے کے بجائے دوستوں کے ساتھ ساتھ اپنی بیوی اور بچوں تک سے چھپائے پھرا۔ وہ خبر ہی ایسی تھی ــ وہ تو کہئے، میرے پاس اتنے روپے ہیں کہ میں نے ایک ہفتہ کے اندر ہی سارا معاملہ جھوٹا ثابت کر دیا ــ پیسے کی یہی تو سب سے بڑی خوبی ہے کہ اس سے جو چاہو خرید لو۔

وقت پر لگائے اڑتا رہا، تیز بہت تیز ــــ میں ترقی کرتا رہا۔ میرا مکان ایک منزلہ سے دومنزلہ اور پھر تین منزلہ ہو گیا ــــ بابا، ماں، بھیا، بھابھی وغیرہ سے میری دوری بڑھتی گئی ــ فرصت کہاں رہتی کہ ان سے جا کر ملوں ــــ ایک دن اخبار میں دیکھا کہ بھیا کو کوئی بڑا ایوارڈ ملا ہے۔ لوگ پکڑ پکڑ کر مجھے مبارکباد دینے لگے ۔ میرے ایس۔ پی صاحب کو بھی معلوم ہوا، تو مجھے بلا بھیجا اور بڑی عزت سے اپنے سامنے کی کرسی پر بٹھایا، بڑی دیر تک بھیا کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ــــ اس دن میرا سر فخر سے اونچا ہو گیا ــ اور بھیا اور مجھ میں کیا فرق ہے، سمجھ میں آنے لگا ۔ میں دوڑا دوڑا بھیا کو مبارکباد دینے گیا۔ اس دن بھی وہ اسی خلوص، محبت اور مسکراہٹ کے ساتھ ملے ۔ کوئی تبدیلی نہیں، کوئی حرف شکایت نہیں ۔ ہمیشہ کی طرح ان کے کمرے میں دانشوروں کی بھیڑ اکٹھا تھی اور چائے کا دور چل رہا تھا ــ میں سوچنے لگا ــ میرے پاس ایسے لوگوں کی بھیڑ کیوں نہیں ہوتی ۔ یہاں نہ شاندار ڈرائنگ روم ہے، نہ اے سی ہے، نہ قالین ہے، نہ نرم نرم صوفہ ہے ــــ پھر بھی بھیا خوش ہیں ۔ ان کے بچے خوش ہیں، بھابھی خوش ہیں ۔ گھر کے اندر گیا تو دیکھا بابا اور ماں اپنے کمرے میں ہیں اور بھیا کے بچے کوئی اپنے دادا کا پاؤں دبا رہا ہے کوئی دادی کے سر میں مالش کر رہا ہے۔ اور کہانی چل رہی ہے، راجہ رانی کی، دیو پریوں کی ــــ

یہ لمحہ، یہ پَل ـــــ لگا میں یہ لمحہ، یہ پَل چُرا لوں ـــــ آج نہ جانے کیوں، مجھے یہ شکستہ اور پرانا، لیکن خوشیوں سے بھرا گھر بڑا اچھا لگا ـ میری نظروں کے سامنے سوالوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا ـ ان ہی سوالوں کے ادھیڑ بن میں، میں گھر پہنچا ـ کار کا ہارن سن کر چوکیدار نے مین گیٹ کھولا ـ کار کو پورٹیکو میں ہی چھوڑ کر گھر کے اندر داخل ہوا ـ دیکھا ڈرائنگ روم میں میری بیوی سونے کے زیورات سے سجی سنوری اپنی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھی ہے ـ دوسرے کمرے میں، میرے بچے اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر کسی نئی فلم کا کیسٹ دیکھ رہے ہیں ـــ میں دونوں کمروں سے گزرا ـ لیکن کسی نے بھی میرے آنے کی نوٹس نہیں لیا ـــــ میں اپنے بیڈ روم میں آ گیا ـ کپڑے تبدیل کر کے اپنے بستر پر نڈھال گر پڑا ـ تپائی پر رکھا آج کا اخبار اُٹھایا ـ لیکن یہ کیا ـ ؟ میری نظریں اخبار پر تھیں لیکن ذہن سوالات کے ادھیڑ بن میں کھویا ہوا تھا ـ اخبار کے پورے صفحہ پر سوال ہی سوال بکھرے پڑے ہیں ـــ میں نے صفحہ پلٹ دیا، لیکن دوسرے صفحہ پر بھی وہی سوالیہ نشانات ـــــ میں اسی طرح صفحات پر صفحات پلٹتا رہا اور ہر صفحہ پر مجھے سوالیہ نشان ہی نشان نظر آئے ـ گھبرا کر میں نے اخبار کو دور پھینک دیا ـ اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر لیٹ گیا ـ

کافی دیر بعد میری بیوی کمرے میں داخل ہوئی ـــــ

"ارے آج کیا بات ہے، آپ اس طرح خاموشی سے لیٹے ہوئے ہیں" ـ بیوی نے سوال کیا ـ

"تمہیں میری پرواہ ہی کہاں رہتی ہے ؟" "یہ شاندار مکان، یہ آرام و آسائش، تمہیں فرصت کہاں دیتی ہے ؟" ـــ میری بات سن کر بیوی خاموش ہو گئی ـ

کچھ دیر بعد میں نارمل ہوا، تو مجھے یاد آیا ـ آج میرے بیٹے ارشد کے میٹرک کے ریزلٹ کا دن ہے ـ میں نے بیوی سے پوچھا ـــ "کیا رہا ارشد کا ریزلٹ ـ ؟"

بیوی میرا سوال سن کر خاموش رہی ـ لیکن میرے استفسار پر جو جواب اس نے دیا، اسے سن کر مجھے ایک جھٹکا لگا ـــــ

"ارشد کا ریزلٹ خراب ہو گیا ہے، اگلے سال ضرور پاس کر جائے گا" ـ

بیوی نے یہ بات اتنے اطمینان سے کہی جیسے کوئی خاص بات ہی نہ ہو۔ مگر میں چیخ پڑا۔
"بلاؤ اسے، کہاں ہے وہ"۔

تھوڑی دیر بعد ارشد کمرہ میں داخل ہوا۔ چہرے پر ناکامی کا کوئی تاثر نہ تھا۔
"کیا میاں، سنا تمہارا رزلٹ خراب ہو گیا ہے۔" میرے سوال پر وہ خاموش رہا۔
مجھے اس کی خاموشی گراں گزری، اور میں نے آگے بڑھ کر اس کے گالوں پر دو چار تھپڑ لگا دیئے۔
وہ رو پڑا۔ اور اپنی ممی سے لپٹ گیا۔ وہ کافی دیر تک اپنی ممی سے لپٹا سسکتا رہا۔ مجھے بھی
افسوس ہونے لگا۔ آج پہلی بار میں نے اپنے پھول جیسے بیٹے کی پٹائی کر دی تھی۔ لیکن کیا کرتا
اس کی ناکامی نے میرا منہ چڑھا دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے ارشد کو اپنے قریب بلایا، اپنے سینے سے لگایا اور اسے
سمجھانے لگا۔ "بیٹے، دیکھو پڑھائی، لکھائی بہت ضروری ہے، دل لگا کر پڑھو گے
تبھی بڑا آدمی ہو گے اور بیٹے اگر بڑا آدمی بننا ہے تو مجھ جیسا مت بننا، جو اپنے ہی خول میں
سمایا ہوا ہے، بلکہ بڑا آدمی، اپنے بڑے پاپا جیسا بننا۔ میں ہرگز بڑا آدمی نہیں ہوں۔ میں نے
اپنے اردگرد ریت کی بنی دھوکے کی دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں اور خود بھی فریب میں مبتلا ہوں
اور تم لوگوں کو بھی مبتلا کئے ہوئے ہوں۔"

یہ کہہ کر میں ارشد کے گال پر بہتے ہوئے آنسو پونچھنے لگا اور میری بیوی سامنے دیوار پر
لگے آئینے کی گرد صاف کرنے لگی۔

ہنسانے والے

ڈگ ڈگ ڈگ ..... ڈگ ڈگ..

ڈگڈگی کی آواز سنتے ہی محلّے کے لوگ دوڑ پڑے۔ آس پاس سے گزرنے والے بوڑھے بچے، عورتیں، جوان سبھی ان کے گرد جمع ہو جاتے اور جب وہ دونوں دیکھتے کہ اچھی خاصی بھیڑ لگ گئی ہے تو وہ لوگوں کے بیچ و بیچ اپنا سامان رکھتے اور پھر ان کا شروع ہو جاتا تماشہ۔

..... ڈگ .... ڈگ .... ڈگ ....

"تو جمورے شروع ہو جا، دِکھا اپنا کمال۔"

"ہاں، استاد، یہ لو ابھی دکھاتا ہوں اپنا کمال"۔ اور یہ کہتا ہوا ایک چھلانگ لگاتا اور سر کے بل کھڑا ہو جاتا۔

بچے ان کے تماشے دیکھ کر تالیاں بجاتے، قہقہے لگاتے اور دوسرے لوگ بھی ان کے کرتب کو دیکھ کر ہنسنے پر مجبور ہو جاتے۔ تھوڑی دیر میں تماشہ ختم ہوتا اور وہ دونوں لوگوں کے سامنے اپنی بوسیدہ چادر پھیلا دیتے۔ دو تین جگہ اس طرح کے تماشے دکھا کر اتنے پیسے جمع کر لیتے کہ وہ اپنی ماں اور اپنے پیٹ کی آگ بجھا کر رات گئے سو جاتے اور پھر صبح ہوتے ہی دونوں نکل پڑتے۔ گلی گلی، کوچہ کوچہ.... ڈگ ڈگ ڈگ .... ڈگ ڈگ.....

ان دونوں کی قسمت نے انھیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ کبھی ان لوگوں نے بھی سپنے سجائے تھے۔ خوشنما اور رنگ برنگ سپنے' لیکن کاتب تقدیر نے ان سپنوں کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا اور ان کا ہرا بھرا گھر اجڑ گیا تھا۔ وہ رات کتنی سیاہ اور بھیانک تھی۔ اس رات کا ایک ایک منظر ان کی نظروں کے سامنے رقصاں رہتا تھا۔

رات کا کھانا کھا کر وہ لوگ خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ ان کا باپ بڑا ذہین تھا' اسے اپنی ذہانت پر بڑا فخر تھا۔ دن بہ دن بڑھتی ہوئی پٹرول کی قیمت اور اس کی کمی نے اس کے ذہن کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ اور وہ ایک نیا تجربہ کر رہا تھا' سورج کی روشنی سے تیز رفتار موٹر گاڑیوں کو کیسے چلایا جا سکتا ہے۔ اور کئی سال کی انتھک محنت اور لگن نے اسے ایک راہ دکھا دی تھی۔ اور وہ بہت جلد دنیا کے سامنے اپنا تجربہ پیش کر کے اپنے ملک کی پریشانی کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کا وقار بڑھانا چاہتا تھا۔ وہ روزانہ اپنی بیوی اور بچوں کو اپنے تجربے اور اس میں ملنے والی کامیابی کی تفصیل بتاتا اور وہ لوگ دل ہی دل میں آنے والی خوشگوار اور شاندار زندگی کی رعنائیوں میں کھو جاتے۔ اس رات ان کا باپ بہت خوش تھا' اس کا تجربہ پورے طور پر کامیاب رہا تھا اور دوسرے دن وہ پورے ملک کو یہ خبر دے کر چونکانے والا تھا کہ اچانک ہر طرف سے ایک شور اٹھا' دلدوز چیخ و پکار۔ وہ لوگ چونک پڑے۔ دروازہ پیٹا جانے لگا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو دیکھا ایک پڑوسی خوف سے کھڑا کانپ رہا ہے۔ بہت مشکل سے وہ بس اتنا کہہ سکا۔ "بھاگو' دنگا ہو گیا ہے"۔ یہ سن کر اس کا باپ پریشان ہو گیا۔ اسکی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے فوراً بچوں کو لے کر بیوی کو گھر کے پچھلے دروازے سے نکل جانے کو کہا۔ اس کی بیوی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "نہیں میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔"

"دیکھو ضد نہ کرو' تمہاری یہ ضد ہم سبھوں کو ختم کر دے گی"۔ اس نے جواب دیا۔ اور صدر دروازے سے باہر نکل گیا۔ ماں دونوں بچوں کو لے کر پچھلے دروازے سے باہر نکلی اور بھاگتی چلی گئی۔ ان کے ساتھ سینکڑوں لوگ بھاگ رہے تھے۔ ہر طرف شور' چیخ و پکار' آگ اور خون'

پورا ماحول خوفناک اور وحشت ناک ہو رہا تھا۔ وہ لوگ دوڑتے دوڑتے ایک جگہ ٹھوکریں کھاکر گرے اور پھر اندھیرے کی دبیز چادر نے اُنہیں دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔

دوبارہ آنکھیں کھلیں تو بھیانک رات گزر چکی تھی اور صبح کا اُجالا پھیل رہا تھا۔ لیکن اس وقت تک ان کا سب کچھ جل چکا تھا۔ ان کے خوشنما خواب، رنگین سپنے، انگڑائیاں لیتی ہوئی تمنائیں سب جل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں اور ان کے سامنے لاشوں کے انبار میں ان کے باپ کی لہولہان لاش پڑی تھی۔

وقت بڑی تیزی سے گزرتا رہا۔ بہت جلد لوگوں کے چندے، ہمدردیاں ختم ہو گئیں اور اب وہ ایسے دوراہے پر کھڑے تھے جہاں سے دور تک کوئی راستہ نہیں جاتا تھا۔

ماں کی گرتی صحت، دواؤں اور بھوک کی شدت نے انھیں کشکول اٹھانے پر مجبور کرنا چاہا لیکن ضمیر نے اسے گوارا نہیں کیا۔ پھر بچپن کا شوق کام آیا اور ایک دن ان دونوں نے ڈگڈگی اٹھالی اور شروع ہو گیا سلسلہ۔ "تو، جمورے دِکھا اپنا کمال۔"

غموں سے چور اور دُکھ درد کی گہرائیوں میں ڈوب کر وہ لوگوں کو ہنسانے لگے۔ آہستہ آہستہ بے رحم وقت نے ان کے زخموں پر مرہم رکھ دیا لیکن ان کی ماں کے لہولہان جسم کے زخم ہمیشہ ہرے رہے، دونوں بیٹوں کی ساری کوششوں کے باوجود اس کے چہرے پر کبھی مسکراہٹ نہیں آئی اور ایک دن وہ روح کے زخموں کی تاب نہ لاکر چل بسی ــ دونوں بیٹے چیخ پڑے۔ "نہیں ماں، نہیں تو ہمیں چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ اب کس کے سہارے جیوں گا۔ کس کی گود میں سر رکھ کر پل دو پل کا سکون اور ممتا کا پیار ملے گا ــ ماں ......" لیکن ماں ابدی نیند سو چکی تھی، تمام صعوبتوں سے وہ آزاد ہو چکی تھی، ہر دُکھ درد سے وہ مُکتی پا چکی تھی۔

ان دونوں کی چیخ و پکار سن کر آس پڑوس کے لوگ جمع ہوئے۔ ہمدردوں نے دو بول بولے اور چل دئے۔ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ ماں کے آخری سفر کی تیاری؟ ان کے سامنے مسئلہ بن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ان دونوں نے دو چار لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے، "بابا، کچھ پیسے

دے دو، میری ماں مرگئی ہے "۔ جواب میں لوگوں کی گالیاں اور دھتکار ملی، "جا، بھاگ سالے، تم لوگوں کی روز ہی ماں مرجاتی ہے۔ سالوں نے بھیک مانگنے کا ایک نیا دھندہ بنالیا ہے۔ سالوں کی شکل تو دیکھو آنکھوں میں ایسے آنسو بھر رکھا ہے، جیسے سچ مچ ان کی ماں مرگئی ہے۔" لوگ انھیں دھتکارتے ہوئے آگے بڑھتے گئے ــــ اب کیا کیا جائے۔ رات سے صبح اور صبح سے دوپہر ہوگئی، کفن دفن کا کوئی انتظام نہیں ہوا ـــ دونوں نے ایک دوسرے سے سوال کیا، لیکن جواب کسی کے پاس نہیں تھا ـــ تو کیا ہماری ماں اسی طرح پڑی رہے گی ۔؟

اچانک ان کے دماغ میں ایک خیال آیا اور پھر.... ان کے ہاتھوں میں ڈگڈگی تھی۔ ڈگ ڈگ ڈگ..... عورتیں، بچے، جوان، بوڑھے سب ان کے گرد جمع ہونے لگے، اور جب بھیڑ لگ گئی تو ہمیشہ کی طرح ایک نے ہانک لگائی۔ "ہاں تو جمورے، دکھا اپنا کمال "۔ اور دوسرے نے "یہ لو استاد، دکھاتا ہوں ابھی اپنا کمال ۔" اور یہ کہتا ہوا وہ بندروں کی طرح قلانچیں بھرتا سر کے بل کھڑا ہوگیا ۔ بچوں نے تالیاں بجائیں اور بڑے بے اختیار ہنس پڑے۔ وہ نئے نئے کرتب دکھانے لگے، اور لوگ قہقہے لگاتے رہے۔ اس بات سے بالکل بے نیاز کہ آج انھیں ہنسانے والوں کا دل کتنا رو رہا ہے، وہ اپنی ماں کی لاش کو دفنانے کے لئے ہنس رہے ہیں ہنسا رہے ہیں۔

کرتب دکھا کر انھوں نے چادر بچھادی اور اس چادر پر پیسے، دس پیسے، بیس پیسے پچاس پیسے گرنے لگے۔ چند لمحوں بعد ان دونوں نے سارے پیسے یکجا کئے اور غم سے نڈھال تھکے قدموں سے چل دیئے، اپنی ماں کے کفن دفن کی تیاری کے لئے!

———✣———

تشویش

بہت دنوں کے بعد اچانک ان سے بازار میں ملاقات ہوگئی۔ سلام کلام کے بعد ہم دونوں نے ایک دوسرے کی خیریت پوچھی۔ وہ بتلانے لگے کہ "یہاں ایک جگہ زمین مل گئی ہے۔ آج اس کی رجسٹری ہے، اسی سلسلے میں مصروف ہوں۔"

"تو شام میں آپ فری ہیں نا؟"

"ہاں بالکل۔"

"پھر شام میں غریب خانے پر آجائیے، شام کی چائے اور رات کا کھانا ساتھ کھائیں گے۔"

"مکان میرا گاندھی نگر میں کسی سے پوچھ لیجئے گا پتا چل جائے گا۔"

"ٹھیک ہے ضرور آؤں گا۔" یہ کہہ کر انہوں نے مصافحہ کیا اور آگے بڑھ گئے۔ میں کئی منٹ تک کھڑا ان کے بارے میں سوچتا رہا، کتنی تبدیلی آگئی ہے، کتنے بدلے بدلے نظر آرہے ہیں۔ چہرے پر شادابی ہے، صحت بھی شاندار ہوگئی ہے، کپڑے بھی قیمتی ہیں۔

ایک وہ دن تھا جب قاسم بھائی دانے دانے کو محتاج تھے، کتنی غربت اور افلاس بھری زندگی تھی ان کی، لیکن اب تو زندگی ہی بدل گئی ہے۔

میں یہی سب سوچتا بازار سے گھر آگیا، بیوی کو تاکید کی کہ شام کی چائے اور رات کے

کھانے پر ہمارے قاسم بھائی آ رہے ہیں، کھانا ذرا پُرتکلّف ہونا چاہئے۔"

بیوی انتظام میں مصروف ہوگئیں اور میں شام اور رات کے کام نپٹانے لگا کہ قاسم بھائی کے آجانے کے بعد گپ شپ کا سلسلہ شروع ہوگا تو نہ معلوم کتنی رات گئے وہ سلسلہ ختم ہوگا۔"

شام ہوگئی اور میں انتظار ہی کرتا رہا۔ مایوس ہوکر بیوی، بچّوں کے ساتھ ہی چائے پی لی۔ بیوی تشویش کا اظہار کرنے لگیں کہ "اگر کھانے پر بھی نہیں آئے تو....."

میں خاموش رہا، اس لئے کہ میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ اچانک ساڑھے نو بجے شب میں دروازے پر دستک ہوئی، دروازہ کھُلا تو دیکھا، سامنے قاسم بھائی کھڑے ہیں۔ کہنے لگے۔ "ارے کیا بتاؤں رجسٹری میں کافی تاخیر ہوگئی۔ پھر حساب کتاب میں وقت لگ گیا، مجھے بے حد افسوس ہے کہ تمہیں انتظار کرنا پڑا"۔ میں نے کہا۔ "کوئی بات نہیں آیئے۔ ویسے ہم لوگ تو مایوس ہو رہے تھے۔"

ڈرائنگ روم میں آکر وہ بیٹھ گئے، کہنے لگے "یار تم نے مکان بڑا شاندار بنوایا ہے، یہ ٹی۔وی کس کمپنی کی ہے، یہ فریج تم نے لے لیا ہے، بڑا اچھا کیا۔ اس گیا کی گرمی میں آدمی تڑپ تڑپ کر مر جائے، اگر پینے کو ٹھنڈا پانی بھی نہ ملے۔ ایرکنڈیشن کیوں نہیں لگا لیتے؟"

"ایرکنڈیشن تو نہیں، ہاں دو کمروں میں کولر لگا لیا ہے۔ اب کچھ راحت ہے، ورنہ دن میں چین تھا نہ رات میں۔ اب خدا کا شکر ہے۔ ایک جنریٹر بھی لے لیا ہے جس سے بجلی کی کمی کی بھی فکر نہیں۔"

میری بات سن کر قاسم بھائی بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے۔" میں بھی اپنا مکان، تمہارے اِس مکان کے طرز پر بنواؤں گا۔ خدا خدا کر کے رجسٹری تو ہوگئی ہے۔ اب صرف سرکاری لون لینا باقی ہے۔"

اچانک وہ کھڑے ہوگئے، "یار وقت نکل جائے گا، ذرا عشاء کی نماز پڑھ لوں، پھر گپ شپ ہوگی اور کھانا کھایا جائے گا۔"

وہ وضو کر کے آئے تو مذاق میں کہنے لگے۔" بھئی وہ جانماز تمہارے گھر پر ہے یا پڑوسیوں کے یہاں سے [illegible] ہو گی۔"

"نہیں، قاسم بھائی، ایسی بات نہیں، جانماز ہے ابھی ابھی تو دادی ماں نماز سے فارغ ہوئی ہیں۔ یہ لیجئے"۔ میں نے بیوی کے ہاتھ سے لے کر جانماز انہیں دی اور جب وہ نماز میں مصروف ہو گئے تو میں نوکر کو میز پر کھانا لگانے کی ہدایت دینے لگا۔

تھوڑی دیر بعد قاسم بھائی نماز پڑھ کر آئے تو کھانا ڈائننگ ٹیبل پر لگ چکا تھا۔ دیکھتے ہی کہنے لگے۔" ارے یہ ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگوانے کی کیا ضرورت تھی، فرش پر لگوایا ہوتا، اپنے حضورؐ کی جہاں تک ممکن ہو، پیروی کرنا چاہئے، ورنہ اب رہ کیا گیا ہے۔۔۔۔"

"ہاں یہ تو صحیح ہے، پر اب کھانا لگ چکا ہے، تو آئیے یہیں کھا لیا جائے۔"

وہ جواب میں مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے، اور ہم دونوں کھانا کھانے کے ساتھ ساتھ آج کے سماجی، سیاسی اور معاشی حالات پر تبصرہ کرنے لگے۔

قاسم بھائی کہہ رہے تھے" اب دیکھو نہ کرپشن کس قدر بڑھ گیا ہے، جدھر جاؤ اُدھر رشوت خوری ہے، چور بازاری ہے۔ ہر چیز کی قیمت بڑھتی جا رہی ہے، آج کل بھلے انسان کا گذر محال ہے۔"

" ہاں، بالکل بجا فرما رہے ہیں، آج کا پورا سماجی نظام درہم برہم ہو گیا ہے، شاید ہی کوئی ایسا محکمہ ہو گا جہاں کرپشن نہیں ہے۔ درس گاہوں میں تعلیم نہیں ہو رہی ہے، لیکن ہر ماہ چھ ماہ پر مشاہرہ بڑھانے کے لئے ہڑتال اور تالہ بندی۔ دفاتر میں لوگ وقت پر نہیں آتے، آتے بھی ہیں تو کینٹین اور اِدھر اُدھر کی لغویات میں مصروف رہتے ہیں۔ کام اسی کا کرتے ہیں جس سے کچھ "اوپری" ملتی ہو یا ملنے کا وعدہ ہو۔ ہسپتالوں میں دوائیں نہیں ملتی ہیں۔ سرکار لاکھوں کی دوائیں دیتی ہے، اور وہ دوائیں، مریضوں کی بجائے بازار میں بکتی ہیں۔ ڈاکٹروں کا یہ عالم ہے کہ نوکری کرتے ہیں سرکاری ہسپتالوں میں، لیکن زیادہ سے زیادہ وقت اپنی پرائیوٹ کلینک میں دیتے ہیں۔ ٹرینوں میں

بغیر ٹکٹ یا ٹی۔ٹی۔ای سے کنٹریکٹ کر کے سفر کرنے کا چلن عام ہے۔اب دیکھئے میرے پڑوسی مسٹر شرما ہیں جو آب پاشی کے محکمہ میں انجینئر ہیں، بارہ لاکھ روپئے صرف مکان بنوانے میں خرچ کیا ہے اور.....''

''ارے تم ایک کی بات کر رہے ہو، آج کل ایسے ہی لوگ اکثریت میں ہیں، جو سماج اور معاشرے کو گھن لگا رہے ہیں، ملک کو کھوکھلا بنا رہے ہیں، میں تو ایسی ہزاروں مثالیں پیش کر سکتا ہوں لیکن دیکھتا رہتا ہوں، تنہا کر بھی کیا سکتا ہوں''۔ قاسم بھائی نے مرغ کی ران دانتوں میں دباتے ہوئے بات جاری رکھی۔''میرا بس چلے تو ایسے تمام لوگوں کو جو ملک، سماج اور سوسائٹی کے دشمن بنے ہوئے ہیں، گولی مار دوں لیکن.....''

کھانا ختم ہو چکا تھا اور ہم دونوں کرسی چھوڑ کر کھڑے ہو چکے تھے۔ ہاتھ دھوئے اور صوفے پر بیٹھ کر چائے کی چسکیاں اور سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے قومی، ملکی، بین الاقوامی اور بین اللسانی مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔

''باتوں باتوں میں رات کے گیارہ بج گئے، پتہ ہی نہیں چلا''۔ قاسم بھائی نے گھڑی دیکھتے ہوئے اجازت طلب کی۔

دروازے تک انھیں رُخصت کرنے گیا۔ جاتے جاتے وہ کہہ گئے ''دیکھو اورنگ آباد ضرور آنا، بس اس سال ہوں، اگلے سال میرا تبادلہ ہو جائے گا۔''

میں نے وعدہ کیا کہ موقعہ ملا تو ضرور آؤں گا۔

وقت گذرتا رہا قاسم بھائی کو گئے دو ماہ ہو گئے ــــ ایک دن اچانک اورنگ آباد سے میرا ایک دوست رمیش ٹھاکر، جس کا وہاں لاکھوں کا بزنس چلتا ہے، پریشان حال میرے پاس آیا اور کہنے لگا ــ''یار امجد بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں، تم ہی میری مدد کر سکتے ہو۔''

میں نے حیرانی ظاہر کی اور پوچھا، پہلے بتاؤ تو سہی بات کیا ہے؟ کہنے لگا ــ''ارے یار وہ تمہارے انکم ٹیکس آفیسر قاسم صاحب ہیں نہ، ان کے یہاں میرا ایک معاملہ پھنس گیا ہے، میں

بے حد پریشان ہوں، اگر معاملہ ٹھیک نہیں ہوا تو میں تباہ و برباد ہو جاؤں گا۔ پلیز یار تم اس معاملہ کو ٹھیک کرادو میں تمہارا احسان مند رہوں گا، چلو ابھی اور اسی وقت، میری گاڑی باہر کھڑی ہے۔"

میں رمیش کے ساتھ چل پڑا اور پھر ٹھیک دو گھنٹہ بعد میں رمیش کو اس کی گاڑی میں چھوڑ کر قاسم بھائی کے مکان میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ لان میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے، مجھے دیکھا تو بڑے تپاک سے ملے، "کہو کیسے ہو سب خیریت ہے نا؟"

"میں تو خیریت سے ہوں لیکن میرا ایک دوست رمیش تھاپڑ مصیبت میں پڑ گیا ہے اور اس کی مصیبت آپ ہی دور کر سکتے ہیں۔"

"رمیش تھاپڑ؟ وہی رائل ٹریڈنگ والے تو نہیں؟"

"جی ہاں، جی ہاں، وہی۔"

"تو گویا آپ مجھ سے ملنے نہیں، بلکہ پیروی میں آئے ہیں۔"

"اب آپ جو سمجھئے، لیکن اسے کسی طرح مصیبت سے نجات دلادیں ـــ"

"لیکن اس نے لاکھوں کی گھپلا بازی کی ہے۔ اسے کیسے چھوڑ دوں، خیر اب تم آئے ہو تو سن لو کہ معاملہ رفع دفع کرنے میں دس ہزار روپے لگ جائیں گے۔"

"اچھا میں رمیش سے بات کرتا ہوں"۔ اور یہ کہتا ہوا رمیش کی گاڑی کی جانب بڑھ گیا اور رمیش سے کہا ـــ "معاملہ ٹھیک ہو جائے گا مگر اس کے لئے پندرہ ہزار روپے دینے ہونگے۔"

"ٹھیک ہے یار میں تیار ہوں"۔ اور یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے بریف کیس سے سو سو روپے کی تین گڈیاں نکال کر میری جانب بڑھا دیں۔

میں روپے کے تین بنڈل لے کر قاسم بھائی کے بنگلہ کی طرف مڑ گیا اور راستے میں خاموشی سے روپیوں کا ایک بنڈل اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا اور آگے بڑھ گیا اور قاسم بھائی کے پاس پہنچ کر روپیوں کے دو بنڈل ان کی جانب بڑھا دیئے۔

انھوں نے ایک نظر دونوں بنڈلوں پر ڈالی اور پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگے...."ٹھیک

ہے، کام ہو جائے گا، تمہاری پیروی ہو اور کام نہ ہو، یہ کیسے ممکن ہے۔ آؤ بیٹھو، چائے پیو۔"

پندرہ منٹ بعد میں قاسم بھائی کی چائے پی کر خوشی خوشی رمیش کے ساتھ لوٹ رہا تھا اور راستے میں آج کل کی بڑھتی ہوئی لاقانونیت اور کرپشن پر ہم دونوں تشویش کا اظہار کر رہے تھے!!!

—— ❖ ——

دلدل

پورے گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ سارے جھانجھ، مجیرے، ڈھول، باجے اچانک خاموش ہو گئے۔ لچھمی کی متوقع آمد کی جو خوشی چھائی ہوئی تھی اور آس پڑوس کی عورتیں اور لڑکیاں جھوم جھوم کر خوشی کے گیت گا رہی تھیں، یکایک لڑکا تولد ہونے کی اطلاع پا کر مایوس اور اداس ہو گئیں اور گھر کی پوری فضا پر غم کے بادل چھا گئے۔

پامیلا کو بھی بجھے اور اداس چہرے دیکھ کر یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اِس بار بھی اوپر والا اس پر مہربان نہیں ہوا اور رحمت کی بجائے زحمت دے دی، پھر بھی اسے یقین نہیں آیا تو اس نے اپنے بستر کے قریب کھڑی دائی سے نقاہت بھرے لہجہ میں پوچھ لیا۔

"بیٹی ہے یا بیٹا؟"

"بیٹا ہوا ہے۔"

دائی کا جواب سن کر اس کی نقاہت اور بڑھ گئی۔ لیٹی لیٹی وہ سوچنے لگی۔

پہلے بیٹے کو تو اس نے کسی طرح قبول کر لیا، لیکن اب پھر یہ دوسرا بیٹا؟ اسے اپنی زندگی بڑی تاریک لگنے لگی، اب اس کا کیا ہوگا، کیسے کٹے گی، کیسے چلے گی، اس کی روایت...

روایت...... روایت..... روایت...

اس کے دل و دماغ پر اس لفظ کے ہتھوڑے برسنے لگے ۔ اس روایت کو توڑ دینے کی اس نے کتنی کوششیں کیں، کتنی جد و جہد کی، کتنی آزمائشوں سے وہ گذری ۔ لیکن سب کے سب اس روایت کے بندھن کے سامنے پگھلتے برف کی مانند بوند بوند ہو کر بھیل گئے اور وہ ٹوٹ گئی ۔ اس نے روایت کے آگے سپر ڈال دی اور پھر شروع ہو گیا رقص اور موسیقی کا سلسلہ اور دھیرے دھیرے وہ اترتی چلی گئی دلدل میں . . . ذلت اور تعفن بھرے دلدل میں ۔ . . . . لیکن مانگے کے اُجالوں سے جگ مگ دلدل، جس کی روشنی اچھے اچھوں کو چکا چوند کر دیتی ہے ۔ وہ خود کو اس دلدل سے بچا نہیں پائی اور اس کے پاؤں کے گھنگھرو کی چھن چھن، ڈھولک کی تھاپ، ہارمونیم کی دھن اور اس پر اس کی سریلی کوئل کی کوک سی آواز ـــــ ایک خاص ناز و ادا سے اُبھرتی تو لوگ جھوم جھوم اُٹھتے' "واہ ـــ واہ ـــ کیا بات ہے کیا ناز و ادا ہے، کیا مدھر آواز ہے "۔ کی صدا دیر تک اس کے سجے سجائے خوبصورت ہال میں گونجتی رہتی ـــ اوپر والے نے اسے غضب کا حسن عطا کیا تھا ۔ گلابی رنگت لئے حسین چہرہ' اس پر بڑی بڑی قیامت ڈھاتی آنکھیں، گداز جسم، مخروطی انگلیاں، صراحی دار گردن اور لمبی گھنیری زلفیں اور اس پر سیدھے دل میں اُتر جانے والی مدھر آواز ۔ وہ جب نغمہ سرا ہوتی تو ایسا لگتا جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو ـــــ اور لوگ مدہوش ہو ہو کر اس کے گلے میں پھولوں اور نوٹوں کا ہار پہناتے جاتے اور وہ ـــ ان تمام باتوں سے بے نیاز گھوم گھوم کر کمر مٹکا مٹکا کر اپنی آواز اور اپنے حسن کا جادو جگاتی جاتی اور واہ ۔ واہ . . . کیا بات ہے . . . . کیا ادا . . . . کیا آواز ہے کی بازگشت کے درمیان میں ہی لوگوں سے جھک جھک کر داد حسن اور داد نغمہ وصولتی ہوئی اچانک چھلانگیں مارتی ہال سے گزرتی ہوئی اپنے کمرے میں واپس چلی جاتی' باہر ہال سے اسے دوبارہ لانے کی فرمائشوں کا سلسلہ جاری رہتا لیکن وہ دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ سر کے ٹھیک اوپر لگے پنکھے کی تیز ہوا سے اپنے صندلی جسم کے پسینہ کو خشک کرنے میں مشغول رہتی کہ باہر سے اس کی ماں کسی اجنبی کو ساتھ لئے ہنستی مسکراتی اس کے کمرے میں داخل ہوتی اور اس اجنبی کا تعارف بڑے دلنواز انداز میں کراتی ۔ دیکھو بیٹی، یہ شہر

کے مشہور سیٹھ شیام جی ہیں، سارے شہر میں ان کی طوطی بولتی ہے۔ اور یہ ....
ماں کا یہ انداز کوئی نیا نہیں ہوتا، وہ ساری بات سمجھ جاتی اور کچھ گھبراتی، کچھ شرماتی ہوئی اُٹھ کر بستر پر بیٹھ جاتی.... سیٹھ جی مسکراتے ہوئے آگے بڑھتے اور یہ کہتے ہوئے اس کے قریب پہنچتے — "اوہ ..... اوہ ..... یہ صراحی دار گردن اتنے بھاری پھولوں اور نوٹوں کے ہاروں سے بہت جُھک گئے ہیں"۔ اور وہ سارے ہار اپنے ہاتھوں سے اُتار کر ہیرے جڑے سونے کا ہار اس کے خوبصورت گلے میں ڈال دیتے اور پھر........ کھڑکی سے باہر جھانکتی ہوئی چاندنی شرما کر بادلوں کی اوٹ میں چُھپ جاتی اور یہ سلسلہ برسوں تک چلتا رہا — شہرت اور دولت گھر کی باندی بنی رہی، لیکن اچانک ایک دن جب اس کی ماں ضعیفی کا دُکھ جھیل کر چل بسی، اس دن اسے دبے پاؤں گذرتے وقت اور تنہائی کا شدید احساس ہوا — وقت کی جلتی دھوپ نے اس کے حُسن اور آواز پر بھی اپنا عکس ڈالنا شروع کر دیا تھا، جس کی وجہ کر رقص اور موسیقی کی محفل بھی بس کبھی کبھار جمتی۔ اس کا مرکز اب پڑوس کی روپ وتی کا گھر بن گیا تھا۔ حُسن اور دولت بڑی تیزی سے اس کا ساتھ چھوڑنے لگے — ایسے میں اسے اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا — اور وہ اپنے بھیانک مستقبل اور تنہائی سے گھبرا کر ماں بننے پر مجبور ہو گئی، اس نے سوچا کہ بچی پیدا ہوگی تو ضرور میری ہی طرح حسین اور قیامت خیز ہوگی۔ ہر طرف اس کے حسن اور اس کی آواز کے چرچے ہوں گے — پھر تو — دولت اور شہرت اس کے قدم چومے گی — لیکن ایسا نہ ہوا۔ لڑکی کی بجائے لڑکا اس کی آغوش میں مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ کر اس کی ممتا جاگ اُٹھی اور اس نے سوچا یہ لڑکا بھی اس کے تاریک مستقبل میں روشنی پیدا کر سکتا ہے۔ اور یہ سوچ کر اس نے اپنے دل کی اداسیوں کو کھرچ کر پھینک دیا اور ایک نئے جوش اور ولولہ سے وہ اپنے بیٹے کو بڑے لاڈ پیار سے پوسنے پالنے لگی، اسے اچھی تعلیم دے کر ایک بڑا آدمی بنانے کے خواب میں بڑی چمک تھی، لیکن کاتبِ تقدیر — دور کھڑا مسکرا رہا تھا۔

پا میلا ایک دن بڑی اُمنگوں اور چاہتوں کے ساتھ اپنے بیٹے کو لئے ایک انگلش اسکول میں

داخلہ کرانے پہنچی، تو ایک سوال نے اس کے دل، دماغ، ذہن کو جھنجھنا کر رکھ دیا۔

"لڑکے کے پتا کا نام کیا ہے؟" پتا کا نام .....؟

وہ دیر تک سوچتی رہی، سوچتی رہی اور آخر کار اس نے ایک فرضی نام دے دیا، ایسا نام جو انام تھا ــــ لیکن سماج کے لوگوں کی نگاہیں بڑی تیز ہوتی ہیں ــــ بیٹا آئے دن اپنی ماں سے شکایت کرتا کہ ماں، میرے دوست میرے پتا کا نام پوچھتے ہیں، میں انھیں کیا جواب دوں؟ ماں اسے کچھ نہ کچھ سمجھا دیتی، سمجھانے کو تو وہ سمجھا دیتی، لیکن اندر ہی اندر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی رہتی اور ایک دن سر سے پانی گزر گیا۔ جب بیٹا روتا ہوا آیا اور ماں سے شکایت کی کہ ماں، اب میں اسکول نہیں جاؤں گا، اس لئے کہ اسکول سے باہر نکلتے ہی سارے بچے شور مچاتے ہیں اور کہتے ہیں ــــ "بن باپ کا بچہ ــــ ہاں جی۔"

پامیلا یہ سن کر غصہ سے پاگل ہوگئی ــــ لیکن جلد ہی اس نے اپنے غصّہ پر قابو پالیا کہ وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ کیسے کیسے سمجھاتی، کس کس پر غصہ کرتی ــــ بیٹے نے اسکول جانا بند کر دیا اور وہ صبر کر کے رہ گئی۔

اسے ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آنے لگی۔ مستقبل میں روشنی کی کرن بس اب ایک بیٹی تھی ــــ اور اسی روشن مستقبل کے لئے وہ دوبارہ ماں بننے پر مجبور ہوئی۔ لیکن اس بار بھی ــــ ــــ قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ نفرت بھری نگاہ سے اس نے اپنے پہلو میں پڑے بچے کو دیکھا۔ جی چاہا کہ .... لیکن وہ ایسا کچھ نہ کر سکی، اس لئے کہ وہ ایک ماں تھی، اس نوزائیدہ کے جسم میں اس کا لہو دوڑ رہا تھا ــــ وہ بے اختیار اسے گود میں لے کر پیار کرنے لگی ــــ اور اپنے آپ کو قسمت کے بہتے دھارے کے سہارے چھوڑ دیا۔

وقت دبے پاؤں بڑی تیزی سے گزرتا رہا، اور اس تیز جھلستی ہوئی دھوپ اسے جلاتی رہی ــــ

اس کے دونوں بیٹے آس پاس کی گلیوں اور محلّوں میں کھیلتے کودتے رہتے، انھیں اپنی ماں

کی بے بسی اور بے کسی کا ذرا بھی احساس نہ تھا۔ اور دھیرے دھیرے اپنے ارد گرد کے ماحول میں وہ دونوں بھی ڈوبتے چلے گئے ـــ بھوک کی شدّت جب ستانے لگتی تو وہ دوڑے دوڑے اپنی ماں کے پاس آتے اور "بہت بھوک لگی ہے ماں" کی صدا لگاتے۔ ماں سے جو بن پڑتا، ان کے سامنے رکھ دیتی اور وہ دونوں کھا پی کر پھر گھر سے باہر نکل جاتے۔

پامیلا، ہر وقت، ہر لمحہ فکر مند رہنے لگی ـــ کیا ہوگا، کیسے ہوگا ـــ رقص اور موسیقی کی محفل اب اس گھر کے لئے یادِ ماضی بن چکی تھی ـــ بس کبھی کبھار کچھ گاہک آجاتے اور وہ تھک کر چور کمرے سے باہر نکلتی تو دیکھتی، دروازے کے قریب بیٹھے اس کے دونوں بیٹے بھوک بھوک کی رٹ لگائے ہوئے ہیں اور وہ اپنی بند مٹھیوں میں دبے کچلے روپیوں میں سے چند روپیے نکال کر انھیں دیتی اور وہ دونوں خوشی خوشی روپے لے کر باہر کسی دکان کی طرف بھاگ جاتے۔ لیکن یہ سلسلہ بھی دھیرے دھیرے اس کی ڈھلتی عمر کے ساتھ کم ہونے لگا۔ کتّے بھی گوشت لگے ہڈی کو ہی بھنبھوڑتے ہیں۔ پامیلا کے، اپنے پڑوسیوں کے سامنے پھیلے ہاتھ بھی اب خالی رہنے لگے تھے۔ پڑوسیوں اور دوستوں نے بھی قرض دینا بند کر دیا تھا کہ انھیں واپسی کی کوئی امید نہ تھی۔

ان حالات سے گھبرا کر اس نے گھر سے باہر قدم نکالے۔ دائی یا نوکرانی کا کام کرکے پیٹ بھرنے کے لئے۔ لیکن کاتبِ تقدیر نے اس کے جسم کے انگ انگ پر ایسی دائمی مہریں ثبت کر دی تھیں کہ وہ ان مہروں کو چاہ کر بھی نہیں چھپا پاتی ـــ اور لوگ ـــ ان مہروں کو صاف پڑھ لیتے۔ اور دو چار دنوں بعد ہی اس کی چھٹی ہو جاتی ـــ اس نے اپنے بیٹوں کو بھی بہت سمجھایا کہ کہیں چھوٹا موٹا کام ہی کریں، تاکہ زندگی کی لڑکھڑاتی گاڑی کسی طرح آگے بڑھے۔ لیکن وہ دونوں کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر لیتے اور اپنی آوارگی جاری رکھتے۔

ایک دن پامیلا ان ہی ادھیڑ بن میں بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی کہ دونوں بیٹے "بہت بھوک لگی ہے ماں" کی آواز لگاتے ہوئے حسبِ معمول گھر کے اندر داخل ہوئے۔ پامیلا کو معلوم تھا

کہ گھر میں کھانے کو آج کچھ بھی نہیں ہے۔ ان دونوں کی ضد بڑھتی گئی تو پامیلا اپنے غصہ پر قابو نہ رکھ سکی اور وہ ان دونوں پر ٹوٹ پڑی۔

"کمبختو ـــ کہاں سے میں تم لوگوں کو دن رات بٹھا کر کھلاؤں ـــ کوئی کام دھندہ نہیں کرتے۔ ہر وقت آوارگی کرتے پھرتے ہو ـــ تم دونوں میرے لئے گاہک ہی تلاش کر کے لاؤ جس سے میں تم دونوں کے پیٹ کی دوزخ کو بھرتی رہوں ـــــ"

درد میں ڈوبتی پامیلا کی چیختی ہوئی آواز اور ان دونوں بے حس لڑکوں پر برستے ہوئے اس کے تھپیڑ ایک عجیب سماں پیش کر رہے تھے۔

دونوں کو دیر تک پیٹتے رہنے اور گالیاں دینے کے بعد، وہ تھک کر نڈھال ہوگئی اور دروازے کے ایک کنارے پر بیٹھ گئی۔ دونوں بیٹے اپنے گالوں کو سہلاتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے۔ پامیلا دروازے پر بیٹھی خاموشی سے انھیں جاتی دیکھتی رہی اور گھنٹہ بھر بعد اس کی آنکھیں حیرت اور تعجب سے پھیل گئیں۔ اس کے دونوں بیٹے ایک اجنبی کو ساتھ لئے خوشی خوشی لوٹ رہے تھے ـــ چند قدم کے فاصلے ہی سے ان دونوں نے مسرت بھرے لہجہ میں چیختے ہوئے اپنی ماں کو آواز دی ـــ

"لو ماں، ہم تمہارے لئے گاہک لے آئے !"

انقلاب

آج پورے تیس برسوں بعد اِس گاؤں میں داخل ہو رہا ہوں۔ اپنے اس گاؤں کو دیکھنے کی تمنا کب سے دل میں دبائے تھا۔ لیکن امریکہ جیسے بڑے ملک کے بڑے شہر کی بھاگ دوڑ میں کتنی تمنائیں جنم لیتی ہیں اور دم توڑ دیتی ہیں۔ میری یہ تمنا وقتی طور پر دب جاتی لیکن جب کوئی لمحہ اپنا ہوتا اور اپنے لوگ یاد آتے تو اپنا یہ گاؤں ضرور یاد آتا اور آخرکار آج میں پورے تیس برسوں بعد میں اپنے گاؤں میں داخل ہو رہا ہوں ——

میرا یہ پرانا گاؤں اور گذشتہ تیس برسوں تک میرے دل و دماغ میں بسا یہ گاؤں — اب وہ گاؤں نہیں رہا — کتنی تبدیلی آگئی ہے۔

گاؤں میں داخل ہوتے ہی سب پہلے اپنی پرانی یادوں کے سہارے یہاں کے قبرستان جاتا ہوں، پہلے یہ قبرستان کتنا پھیلا ہوا تھا، لیکن آج یہ چاروں طرف سے گھر کر کتنا سمٹ گیا ہے، میں اپنے دادا ابا کی قبر تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن یادداشت ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ یا شاید قبروں کی بھیڑ میں وہ قبر گم ہو گئی ہے۔ میں ایک انداز کے سہارے ایک نیم کے پیڑ کے قریب کھڑا ہو کر اپنے دادا ابا کو یاد کرتا ہوں اور فاتحہ پڑھتا ہوں۔ فاتحہ کے بعد دادا ابا کی یادیں بے چین کرنے لگتی ہیں، میری آنکھیں بھر جاتی ہیں میں آنسو پونچھتا

ہوا قبرستان سے باہر نکل آتا ہوں ۔ باہر نکل کر وہ کنواں تلاش کرتا ہوں جس میں رہہٹ لگا تھا اور اس کے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے میں اپنے دوستوں کے ساتھ نہایا کرتا تھا لیکن وہ رہہٹ غائب تھا، کنواں بھی موجود نہیں تھا بلکہ اس کی جگہ ایک مکان کھڑا تھا۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ دس بیس قدم کے فاصلے پر راستے کے کنارے بنا وہ بڑا سا چبوترہ تلاش کرتا ہوں جس پر شام کے وقت دن بھر کے تھکے ماندے گاؤں کے لوگ بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے ۔ ایک دوسرے کی خیر خبر لیتے اور پھر تبصرہ کرتے اور یہ تبصرہ، گاؤں، شہر، ضلع، صوبہ، ملک اور بیرون ملک تک کے حالات پر رات گئے تک جاری رہتا۔ ان دنوں امریکہ اور برطانیہ وغیرہ کا ذکر خصوصی انداز میں کیا جاتا بلکہ ان ملکوں کو بالکل جادونگری بنا کر پیش کیا جاتا، جسے سن کر وہاں پر موجود ہر شخص کے دل میں اُن جادونگری کی سیر کرنے کی تمنا انگڑائیاں لینے لگتیں ۔ اس چبوترے پر کبھی کبھی دبی زبان میں امیر اور زمیندار کسانوں کے ظلم اور استحصال کی باتیں بھی ہوتیں۔ لیکن یہ باتیں اتنے چپکے چپکے اور سہمے سہمے انداز میں ہوتیں کہ ذرا فاصلے پر بیٹھا شخص بھی نہیں سن پاتا تھا۔ گاؤں کے اس چبوترے کی بڑی اہمیت تھی۔ گاؤں کے اندر ہونے والی بہت ساری تبدیلیوں میں بڑا اہم رول رہتا تھا۔ اس چبوترے پر کئی اہم پنچایتیں بھی ہوئی ہیں، لیکن افسوس کہ آج وہ دوستی، بھائی چارگی اور عدل و انصاف کا گواہ چبوترہ غائب ہے۔ میں نے سوچا وہ چبوترہ غائب ہے تو پھر رحیمو دادا، قدرت دادا، مکھن لال جی، ستیہ نارائن سنگھ جی، ہریا، سُکھ لال یادو، رمیا، کرپال سنگھ رام شرن شرما، مادھو گرمی، رحمان خاں، خالق انصاری وغیرہ کہاں پر ایک ساتھ مل جل کر بیٹھتے ہوں گے۔ کہاں پر بیٹھ کر ایک دوسرے کا دُکھ سُکھ بانٹتے ہوں گے۔ شاید اس چبوترہ کے ختم ہونے کا ہی یہ اثر ہے کہ اکثر مجھے امریکہ میں اخباروں سے یہاں کی ایسی خبریں دیکھنے کو ملتیں جنھیں پڑھ کر دل دہل جاتا۔ ایک ساتھ پچیس تیس لوگوں کو قتل کر دینے کی رپورٹ اور تصویریں۔ درندگی کے ایسے ہولناک حادثہ کی خبر کا اثر میرے دل و دماغ پر کئی دن رہتا، لیکن پھر آہستہ آہستہ نارمل ہو جاتا۔ میں سوچتا، آج جب امریکہ، روس، برطانیہ، چین، شام، فرانس اور دوسرے ممالک

میں نسلی فسادات اور اختلافات کے لاکھوں کروڑوں لوگ شکار ہو رہے ہیں ۔ ریشہ دوانی، استحصال، ظلم، تشدد، عالمی غنڈہ گردی اور انتہا پسندی کا بازار گرم ہے ۔ ایسے میں ان ممالک کی گرم ہوا ان گاؤں تک پہنچنا ممکن نہیں ۔ اور شاید ....

اچانک میری سوچ کا دائرہ سمٹ گیا، میری نظروں کے سامنے گاؤں کے کئی لوگ کھڑے مجھے بہت غور سے دیکھ رہے تھے، ایک اجنبی کو اس طرح گاؤں میں دیکھ کر حیران تھے ۔ میرا یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ کل تک جو گاؤں میرا تھا، یہاں کا چپہ چپہ گلی گلی کوچہ کوچہ جانا پہچانا تھا، آج میں یہاں پر ایک اجنبی کی طرح کھڑا تھا ۔ میں ان لوگوں کے قریب جاتا ہوں اور پوچھتا ہوں ـــ

"بھائی، یہاں آس پاس کہیں پر لکھ لال جی کا گھر تھا ۔"

ان لوگوں میں سے ایک آگے بڑھ کر بولا ـــــــــ

" اہیئے جا، ان کر گھر ہئی، لیکن او تو کب کے سورگ باس ہو گیلن ـــ"

" اور ان کا پریوار؟ میں نے بیچ ہی میں سوال کیا ۔

" ان کر پریوار؟ ـــــ وہ شخص بولتے بولتے کچھ جھجک رہا تھا ۔ "ہاں ہاں ان کا پریوار کہاں ہے؟" میں نے استفسار کیا ۔ "او سب تو پرے سال کے کانڈ میں کھتم ہو گیلن، ان کر مکنو جل کر راکھ ہو گیلئ اور ...."

مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی ۔ میں کچھ دیر خاموش رہا ۔ ہم نے اپنی یادوں کے سہارے اپنے ایک حلیم دادا کے بارے میں پوچھا ۔

" او بھی تو کب کے سورگ باس ہو گیلن، ہاں ان کے پریوار سہر میں جاکر رہے ہتن ـــ"

اور شہابو چچا ـــ ؟

" ہاں، او تو ہتی، اُن کے لیکن لوگ سہر میں رہے ہتن، کبھی کبھی آوا ہتن سہابو گنواں کہت ہیں کہ ای گاؤں جندگی بھر ہم نہ چھوڑب ۔ ہمار باپ دادا کے نسانی ای جابا ....."

" وہ کہاں ملیں گے ۔ ذرا مجھے ان کے گھر تک پہنچا دیجیے ۔"

" میں نے بیچ ہی میں ان کی بات کاٹ کر پوچھا۔
" ہاں، ہاں جرور چلا ہمرا ساتھ۔"
اور میں ان لوگوں کے ساتھ ہو گیا۔ راستے میں کئی لوگ ملے۔ مجھے زیادہ دور نہیں چلنا پڑا۔ چند ہی قدم کے فاصلے پر ایک خاموش اور اُجڑے ہوئے مکان کے دالان میں ایک چوکی پر ایک بوڑھا اور نحیف شخص لیٹا ہوا خلاء میں گھور رہا تھا۔ اتنے ڈھیر سارے لوگوں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ شخص اُٹھ بیٹھا۔
" کا ہے رے رسوا ؟" انہوں نے سوال کیا۔
" اے گو سہرسے آدمی ایلئے ہیں رُوداکے بارے ہیں پوچھلے ہئی۔ سو ہم رُودا کے پاس لے لے آئیلئی۔"
میں سمجھ گیا، یہ بوڑھا شخص ہی شہابو چچا ہیں۔ انہوں نے مجھے غور سے دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی، لیکن ان کی آنکھوں سے اجنبیت ٹپک رہی تھی، "شہابو چچا میں ہوں انور — آپ کے دوست خیرالدین کا بڑا لڑکا۔"
" اوہ — انور ہو تم !۔ ارے کیسے کیسے یہاں آئے بھئی ؟ کیسے کیسے ہم لوگوں کی یاد آئی ؟" شہابو چچا کھڑے ہو گئے اور مجھے گلے لگا لیا۔ دیر تک گلے لگائے رہے۔ مجھے بڑا اچھا لگا ! کتنی اپنائیت تھی، کتنی شفقت تھی۔ یہ میرے اپنے چچا نہیں تھے، لیکن ان کی محبت اور شفقت دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ میرے اپنے نہیں ہیں۔ مجھے یاد آیا امریکہ۔ جہاں اپنے بھی غیروں کی طرح ملتے ہیں۔
شہابو چچا نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھایا اور دیر تک میری اور میرے لوگوں کی خیریت پوچھتے رہے۔
تھوڑی دیر بعد دسترخوان لگا۔ اور کھانے پینے کی کئی چیزیں آ گئیں۔ وہاں پر موجود گاؤں کے لوگوں نے بھی کھانے میں ساتھ دیا، اسی دوران میں نے شہابو چچا سے پوچھا۔ "چچا، ایسا کیا ہے

کہ آپ اِس گاؤں میں اکیلے پڑے ہیں، شہر میں اپنے بچوں کے ساتھ نہیں رہتے ؟ شہابو چچا کچھ دیر تک خلاء میں گھورتے رہے اور پھر بالکل کھوئے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ اس گاؤں کے چپے چپے میں میرے باپ دادا کی نشانیاں ہیں، میں کیسے انھیں چھوڑ کر جا سکتا ہوں ۔ لوگ گاؤں چھوڑ چھوڑ کر شہر میں بس رہے ہیں، جائیں، ضرور جائیں، لیکن میں مرتے دم تک اپنی جڑوں کو چھوڑ نہیں سکتا ۔" شہابو چچا کی یہ بات سن کر مجھے اپنے آپ میں بڑی شرم محسوس ہوئی۔ ایک میں ہوں اور میرے جیسے نہ جانے کتنے لوگ ہیں، جو اپنی جڑوں کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے یا بھاگنے پر مجبور ہو گئے اور........

شہابو چچا نے مجھے زیادہ دیر ان خیالوں میں بھٹکنے نہیں دیا، وہ وہاں پر بیٹھے گاؤں کے لوگوں کا تعارف کرا رہے تھے۔

"ان سے ملو، یہ رام سیوک داس ہیں، گاؤں کے مکھیا ہیں ۔ ان کا بیٹا شہر میں بڑا انجینئر ہے، یہ رام پرساد یادو ہیں ۔ گاؤں کے لوگوں کے لئے بہت کام کرتے ہیں، ان کے دونوں بیٹے شہر میں بڑے آفیسر ہیں، اور یہ ہر دوار کرمی ہیں، ان کا بیٹا صوبہ کا بہت بڑا لیڈر ہے ، بڑی شان سے گاؤں میں آتا ہے اور یہ ...."

شہابو چچا وہاں پر موجود تمام لوگوں کی تفصیل بتا رہے تھے اور میں حیرت اور خوشی کے جذبے میں ڈوبا جا رہا تھا ۔ شہابو چچا کہہ رہے تھے ۔" ہاں ٹھاکر نریش سنگھ کے بارے میں سن کر تمہیں افسوس ہوگا اُن کی حالت اچھی نہیں ہے ۔ ان کے سارے لڑکے عیش و آرام کے عادی بن کر اپنی پوری جائداد ختم کر ڈالی اور آج دانے دانے کو محتاج ہیں، سنا ہے ان دنوں وہ رام کرت مہتو کے یہاں منشی کا کام سنبھالے ہوئے ہیں ۔"

مجھے یاد آیا، وہ دن جب ان کے شاہانہ ٹھاٹ تھے اُن کے دروازے پر ہاتھی جھومتا تھا۔ نوکر، چاکر، گاڑی .... کیا نہیں تھا ان کے پاس ۔ شہابو چچا اپنی باتوں میں اپنی یادداشت کا بہترین مظاہرہ کر رہے تھے ۔ میں بڑی دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہا تھا ۔ آہستہ آہستہ لوگ مجھ سے ہاتھ

ملا کر چلے گئے، صرف میں اور شہابو چچا رہ گئے تو میں نے ان سے پوچھا۔ "یہ مکھ لال جی کا کیا قصہ ہے۔؟"

"بیٹا! مکھ لال جی نے بدلتے وقت کی نبض نہیں پہچانی اور سات بیٹوں کا باپ بن کر ہمیشہ دولت کے نشے میں چور رہا۔ غریبوں، مزدوروں، براہلوں پر ظلم و تشدد اور ان کا استحصال کرتا رہا۔ اس کی چنگاری دہکتی آگ میں تبدیل ہو گئی اور آخر کار ایک دن اُس آگ نے مکھ لال اور ان کے پورے خاندان کو جلا کر راکھ کر دیا، ہمارے رحیمو خاں کا بھی یہی حال ہوا۔ برج بہاری سنگھ بھی اِسی آگ کے شکار ہوئے، ویسے بھی اب پہلے والی بات نہیں رہی، زمانہ بدل چکا ہے جو لوگ بدلتے وقت کی چاپ نہیں سنتے، وہ منہ کی کھا رہے ہیں، آئے دن گاؤں میں بندوقیں گرج رہی ہیں، تیز ہتھیار چمک رہے ہیں۔ لاشوں کے انبار لگ رہے ہیں اور......"

شہابو چچا جذباتی ہو گئے تھے، ان کی آواز بھر آگئی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا! تو گویا اب یہاں کے لوگ بھی جاگ چکے ہیں، یہاں بھی انقلاب آچکا ہے ــــ!

کوئی صدا نہیں

بوڑھے گاؤں پر بھیانک طوفان کے بعد کی خاموشی سی چھائی تھی بس کبھی کبھی کہیں کسی
کتے کے رونے کی آواز یا پھر ایک سمت سے دوسری سمت گذرنے والی چمگادڑوں، گدھوں
اور چیلوں کی پھڑپھڑاہٹ اُبھرتی اور پھر وہی خاموشی اور گہرے سکوت کا عالم۔ زخموں سے چور،
لہولہان جسم، نڈھال بوڑھا ہوش میں آنے لگا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا
اور ایک دلدوز چیخ کے ساتھ ایک بار پھر وہ بے ہوش ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر اسے ہوش آیا
اور اس نے اپنے اندر کی ساری قوتوں کو جمع کر ایک دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہونے کی کوشش کی،
جسم سے کافی خون نکل چکا تھا۔ درد کی شدت سے وہ کراہ اٹھا۔ لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔
اُس کے قدم آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔ دھیرے دھیرے اسے رات کا بھیانک حادثہ یاد آنے لگا۔
بند مکان کے اندر کے لوگوں کو باہر نکالنے کے لئے ایک کمزور دیوار میں شگاف ڈال کر آگ کا
ایک گولا اندر پھینکا گیا تھا اور مکان کے اندر جب ہر طرف آگ بھڑک اُٹھی تو مکیں آگ سے بچنے کے
لئے دوسری آگ میں کود پڑے۔ دروازہ جیسے ہی کھولا گیا بلوائی ایک ساتھ ان پر ٹوٹ پڑے اور پھر
بھیانک دل دہلانے والا منظر تھا۔ سب سے پہلے اس کے بڑے بیٹے پر گولی چلی اور وہ چیخ کر
ایک جانب لڑھک گیا۔ اسے گرتے دیکھ کر اُس کی بیوی گود میں آٹھ ماہ کا بچہ لئے اس کی جانب

دوڑی اور ایک ہی وار میں ماں اور بچہ دونوں ہی چھٹپٹاتے نظر آئے تب وہ دوڑتا ہوا بچہ کے قریب پہنچا تھا اور لاٹھی کی ایک زور دار ضرب پڑی اور وہ کراہتے ہوئے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ایک نے اس پر بندوق تانی تو دوسرے نے کہا کیوں گولی برباد کرتا ہے۔ یہ بڈھا سالا ایسے ہی مر جائے گا۔ اس کے کانوں میں یہ آخری آواز گئی اور پھر وہ اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا۔!

اچانک وہ کسی چیز سے ٹکرایا اور گر پڑا، ٹکرانے والی چیز پر نظر پڑی تو وہ چونک پڑا۔" ارے یہ تو میرا سریش ہے۔ بیٹا سریش، اُٹھ بیٹا، دیکھ یہ تیرا باپ سہارا ڈھونڈ رہا ہے۔ کوئی سہارا نہیں دیتا، تیری آنکھیں کھلی ہیں، تو اپنے باپ کو دیکھ رہا ہے، پھر بھی تو ...... خاموش ہے۔ بیٹا تو تو بڑا انجینئر تھا۔ تو نے کتنے بڑے بڑے پل بنائے۔ ہمیشہ تو نے ترقی اور خوشحالی کے بارے میں سوچا، لیکن ترقی کی یہ کون سی منزل ہے بیٹا؟ تو مجھ سے بحث کرتا تھا آج جواب کیوں نہیں دیتا۔؟"
لیکن سریش جواب کیسے دیتا وہ تو بلوائیوں کے ہاتھوں ڈیم اور پل بنانے کے لئے ترقی پا چکا تھا اس کی آنکھیں شاید اسی لئے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں کہ یہ کس کارنامے کا انعام ہے۔ بوڑھا اس کے اور قریب گیا۔ اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور اس کی کھلی آنکھوں کو بند کر دیا اور پھر وہ سسک پڑا تھوڑی دیر بعد اس کی نظر دور پڑے اپنے آٹھ ماہ کے پوتے پر پڑی۔" بیٹا تیرا کیا قصور تھا۔ تُو تو امانت تھا ہمارے لئے سب کے لئے تو نے ابھی پوری طرح دنیا بھی نہیں دیکھی تھی، تجھ سے کیسے دشمنی ہو گئی کہ تو آج پالنے کی بجائے اس طرح خون میں لت پت گلی میں پڑا ہے۔ بوڑھا اس بچّے کے گالوں کو چومتا ہوا آگے بڑھا۔ شاید کوئی آنسو پونچھنے والا مل جائے، غم بانٹنے والا، لیکن یہاں تو ہر طرف سناٹے کی حکمرانی تھی۔ مکانوں سے اب بھی دھواں اُٹھ رہا تھا۔ اور فضا میں انسانی جسم کے جلنے کی بُو پھیلی ہوئی تھی ـــ بوڑھا ابھی دو چار ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ اس کی نظروں کے سامنے اس کا پڑوسی جمال کئی حصوں میں بکھرا پڑا تھا۔ ارے بیٹا جمالو، یہ تیرے ہاتھ کیوں جسم سے الگ ہیں، تیرے ان ہی ہاتھوں نے تو اس گاؤں میں انقلاب لایا تھا۔ یہاں کے کھیتوں، کھلیانوں کو تو نے ماں کا درجہ دیا۔ بڑا ناز تھا تجھے ان ہاتھوں پر اور ہمیشہ تو ہری کرانتی لانے کی باتیں کرتا تھا۔ یہ تو ہی

تو تھا بیٹا جس کی وجہ کر گاؤں اتنا خوشحال تھا۔ اتنا اناج، اتنا غلّہ پیدا ہوتا تھا کہ دوسرے گاؤں والے رشک کرتے تھے۔ ہمارا یہ گاؤں تو ہمیشہ مثال کے طور پر پیش کیا جاتا تھا، یہاں کبھی کوئی جھگڑا نہیں، کوئی مَت بھید نہیں، ہر کوئی ایک دوسرے کے دُکھ سکھ میں کام آتا تھا۔ پھر یہ سب کیوں ہوا، کیسے ہوا ـــــ کئی لاشوں کے درمیان اسے ماسٹر صاحب کی لاش نظر آئی بوڑھا قریب پہنچا ـــــ ماسٹر صاحب، درندوں نے آپ کو بھی نہیں چھوڑا، آپ نے تو ہمیشہ میل محبت، پیار، بھائی چارگی، اخوت، یکجہتی کا درس دیا۔ گاؤں کا ایک ایک بچہ آپ کی عزت کرتا تھا۔ ان کے والدین آپ کی پوجا کرتے تھے۔ اس گاؤں میں تعلیم پھیلانے کے لئے آپ نے اپنی زندگی وقف کر دی، پھر یہ کس جرم کی سزا آپ کو ملی ....

بوڑھا لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا، اس کے جسم کے زخموں سے خون رِس رہا تھا۔ وہ نڈھال ہو رہا تھا اور ویسے بھی گاؤں کا یہ دلدوز اور خوفناک منظر دیکھنے کے بعد اسے جینے کی تمنّا کہاں تھی۔ وہ اُس لمحے کو کوس رہا تھا، جب ایک نے اس پر بندوق تانی تھی اور دوسرے نے ایک گولی بچانے کے لئے اُسے گُھٹ گُھٹ کر مرنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ شاید یہ میرے کسی جنم کے پاپ کی سزا ہے۔ جس گاؤں کو اس نے اپنے خون پسینہ سے سینچا تھا، محنت اور لگن سے پروان چڑھایا تھا، آج اس کی نظروں کے سامنے کھنڈر بنا ہوا تھا، پورا گاؤں جیسے شمشان میں تبدیل ہو چکا تھا۔ بلوائیوں نے گاؤں کے کسی مکان کو نہیں چھوڑا تھا۔ بوڑھے کو یاد آیا، برسوں قبل زلزلہ کا وہ منظر، صرف بیس منٹ کا وہ زلزلہ، قیامت بن کر ٹوٹا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا گاؤں کھنڈر بن گیا تھا۔ لیکن وہ تو قدرت کا جاہ و جلال تھا۔ اور یہاں، یہاں تو انسانی ہاتھوں نے ایک رات، صرف ایک رات میں قدرت کو بھی شرم سار کر دیا تھا۔ ہرا بھرا یہ گاؤں ہنستے مسکراتے لوگ، لہلہاتے کھیت کھلیان، سب کے سب خاک و خون میں ڈوب گئے۔ جس کنویں اور ندی کے میٹھے اور شیتل جل سے لوگ اپنی اور اپنے کھیتوں کی پیاس بجھاتے تھے۔ وہ کنویں انسانی لاشوں سے بھر گئے تھے۔ ندی کا پانی سُرخ ہو رہا تھا۔ نہ جانے اس نے کتنی لاشوں کو اپنی آغوش میں لے کر وحشی درندوں اور قاتلوں

شرم ساری سے بچالیا ہے۔

بوڑھا آگے بڑھتا ہے، برگد کے پیڑ کے قریب خاک و خون میں ڈوبا سُرجیت ابدی نیند سو رہا ہے۔ بوڑھا چونک پڑا۔ ارے درندوں نے تجھے بھی نہیں چھوڑا۔ بوڑھے کو یاد آیا، سُرجیت کل ہی تو لمبی چھٹی پر گاؤں آیا تھا۔ فوجیوں کو یوں بھی کم ہی چھٹی ملتی ہے! سُرجیت دو سال پر یہاں آیا تھا کتنے فخر سے وہ اپنی بہادری کی کہانی سناتا تھا، کس طرح اس ملک کے دشمنوں کے خلاف مورچہ لیا تھا، اور اپنی جواں مردی سے دشمنوں کے دانت کھٹے کر دئے تھے۔ جس کے لئے اسے تمغہ بھی ملا تھا۔ اور اس تمغے کی لاج بھی غنڈوں نے نہیں رکھی۔ ملک کے دشمنوں کو سبق سکھانے والے اس جیالے کو اپنے ہی ملک کے لوگوں کے ہاتھوں دریدگی پراپت ہوئی۔ سرجیت کے جسم کے زخم گواہی دے رہے تھے کہ اس نے بلوائیوں سے مقابلہ کیا ہے۔ لیکن ایک نہتے فوجی کی سینکڑوں درندوں کے سامنے حیثیت ہی کیا رہی ہوگی ——

چند ہی قدم کے فاصلے پر ندی کے کنارے بوڑھے کو امینہ کی لاش نظر آئی، اس کی لاش بتا رہی تھی کہ بلوائیوں نے اس کی حرمت کو بھی پامال کیا ہے۔ بہت ممکن ہے سُرجیت اسی امینہ کی عزت، عصمت اور جان کی حفاظت کے لئے گاؤں میں گھس آئے غنڈوں سے مقابلہ کیا ہو اور لڑتے لڑتے اپنی جان دے دی۔ تو اس کا مطلب ہے سُرجیت نے یہاں بھی مورچہ نہیں چھوڑا۔ بوڑھے کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ تو قابلِ فخر ہے سُرجیت۔ میں تجھے سلام کرتا ہوں ——

بوڑھا اب بالکل نڈھال ہو چکا تھا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ وحشی درندوں نے گاؤں کو بالکل برباد کر دیا تھا۔ مکانوں کے ساتھ ساتھ آس پاس کے چھوٹے چھوٹے کل کارخانے، اسکول، لائبریری، اسپتال، سب کے سب دھواں اُگل رہے تھے۔ دُھواں، لاش، انسانی جسم کے جلنے کی بُو، کتّوں کی بھونک، چیلوں اور گِدھوں کی پھڑ پھڑاہٹ عجیب خوفناک منظر تھا ——.

بوڑھے کا سر چکرانے لگا۔ وہ ندی کے کنارے ایک پیڑ کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ اسے یاد آیا، اس گاؤں میں تو ہر ذات اور مذہب کے لوگ برسہا برس سے رہتے آئے، یہاں کا ہر تہوار چاہے عید ہو،

دسہرہ ہو، ہولی ہو، شب برات ہو، پورے گاؤں کے لوگ ایک ساتھ مناتے۔ لیکن اچانک یہ سب کیسے ہو گیا؟ سوچتے سوچتے اس کا ذہن ڈوبنے لگا اور وہ ایک پیڑ کے سہارے لیٹ گیا۔ اس کا دل دماغ مفلوج ہوتا جا رہا تھا اور اسے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی اندھے کنویں میں سماتا جا رہا ہے۔ معاً اسے خیال آیا صبح ہوئے اتنی دیر ہو گئی سورج نکل آیا لیکن ابھی تک مندر سے گھنٹے کی آواز اور نہ مسجد سے اذان کی صدا۔

ایسا پہلے تو کبھی ہوا نہیں، اچانک اس کے ڈوبتے ذہن کے پردے پر گاؤں میں ہر طرف پھیلی آگ، خون، لاش، سرخ ندی اور لاشوں سے بھرا کنواں اُبھرا اور اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کیوں آج مندر اور مسجد کے مینارے خاموش ہیں۔ دھیرے دھیرے اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا اور چند ساعتوں بعد اس نے آخری ہچکی لی اور اوپر پیڑ پر بیٹھے پرندے پھڑپھڑا کر اُڑ پڑے۔

ہم قدم

ھر روز کی طرح آج بھی دفتر دیر سے پہنچا، انچارج آفیسر نے اچٹتی نظروں سے دیکھا، کہا کچھ نہیں، اسے بھی شاید میری بے چارگی اور بے بسی پر ترس آتا تھا اور شاید وہ بھی اس سے واقف تھا کہ میری صبح و شام کیسی ہوتی ہے، صبح سے شام اور شام سے رات گئے تک کام اور کام میرا مقدّر ہے۔

دوسروں کے لئے صبح خوشگوار ہوتی ہوگی، شام سہانی اور رات پُر بہار لیکن میرے لئے صبح و شام اور رات میں کوئی فرق نہیں، کہیں کوئی بہار نہیں، بس خزاں ہی خزاں، ہر وقت، ہر لمحہ تیز آندھیوں اور جھکڑوں کا ہی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے مجھے اپنے آس پاس کے لوگوں پر کہ وہ ہنسنے اور قہقہے لگانے کے لئے وقت کیسے نکال لیتے ہیں، لیکن نہیں، میں بھی ہنستا اور قہقہے لگاتا ہوں لیکن میری ہنسی اور قہقہے کتنے کھوکھلے اور بے جان ہوتے ہیں۔ کینٹین میں بیٹھ کر چائے کی چسکی کے ساتھ سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے میرے فلک شگاف قہقہے سن کر کون کہہ سکتا ہے کہ میں اندر ہی اندر کتنا ٹوٹا ہوا ہوں، کتنا بکھرا ہوا ہوں میرا پورا وجود کس قدر زخم آلود ہے۔

میری نظریں فائل پر مرکوز تھیں اور ہاتھ میں قلم لیکن میں خود کہیں اور تھا، شاید میں

خود اپنے وجود کے تعاقب میں تھا ..... کہ اچانک رمیش کی آواز گونجی ۔

"ارے یار انور، یہ تم کہاں ہو۔"؟

"آں، ہاں، کیا ہوا رمیش ۔" میں خیالوں کی دنیا سے واپس آ گیا ۔

"ارے یار، اِدھر دیکھو، آج کا اخبار، ہمارے شہر کو خوبصورت بنانے کے لئے ۱۰ کروڑ کی گرانٹ ملی ہے ۔"

مزہ آئے گا یار، ہر طرف صاف شفاف سڑکیں ہریالی ہی ہریالی، روشنی ہی روشنی.... اور ....۔"

"اور جن کی زندگی میں کوئی روشنی نہ ہو، کوئی ہریالی نہ ہو، ان کے بارے میں کوئی خبر ہے آج کے اخبار میں ۔"

"تو ہمیشہ اُلٹی سیدھی باتیں کرتا ہے ۔ یار تو پاگل ہے یا پھر فلسفی ۔"

"نہیں رمیش میں پاگل ہوں اور نہ فلسفی، بس زندگی کی تلخ حقیقتوں نے میرے منھ میں کڑواہٹیں بھر دی ہیں ۔"

میری اس بات پر رمیش کیا کہہ رہا تھا، اسے میں سنتے ہوئے بھی نہیں سن پا رہا تھا، اس لئے کہ میری نظروں کے سامنے اندھیروں میں ڈوبے میرے گھر کی چہار دیواری تھی، جہاں ہر روز نہ جانے کتنی خواہشوں، چاہتوں اور ارمانوں کو دفن کیا جاتا ہے، میرے گھر کے ہر فرد کے اندر ان گنت تمناؤں کے مقبرے بسے ہوئے ہیں ۔ اور ہر شخص کی انگلی میری ہی طرف اُٹھی رہتی ہے ۔ یہی ہے میرے ارمانوں کا قاتل، یہی ہے میری خواہشوں کا قاتل ــــ یہی ہے........ اتنی انگلیوں کو دیکھ کر میں سوچتا ہوں، میں کس پر انگلی اٹھاؤں، میں کسے قاتل ٹھہراؤں، میں کسے اپنے ارمانوں، اپنی چاہتوں، اپنی خواہشوں کا قصوروار بتاؤں، میں ......"

"اوہ، تم کہاں کھو گئے، میں بکے جا رہا ہوں اور تم ہو کہ بس خاموش ہو......"

"ہاں، یار رمیش، میں سن رہا ہوں، میں سب کچھ سُن رہا ہوں، سچ مچ بڑا مزہ آئے گا،

بڑا اچھا لگے گا ہمارا شہر بیوٹی فیکیشن کے بعد، اتنے روپے میں تو ہمارا شہر جگ مگ، جگ مگ کر اُٹھے گا ..... اور کیا ہے رمیش آج کے اخبار میں......"

میں نے رمیش کی توجہ دوسری طرف مرکوز کرانی چاہی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ رمیش یا کوئی بھی میرے اندر جھانک کر میری حقیقت سے واقف ہو، میری زندگی کی مسخ شدہ تصویر کو دیکھے، رمیش نے بھی میری جانب زیادہ توجہ نہیں دی اور آج کی نئی نئی خبریں سنانے لگا۔

"انور، آج کے اخبار میں کئی اہم خبروں کے ساتھ ساتھ ایک شاندار آرٹیکل اکیسویں صدی پر ہے، ہم لوگ اب جلد ہی اکیسویں صدی میں داخل ہونے والے ہیں۔ ہم نے واقعی کتنی ترقی کر لی ہے، آج کا دور کمپیوٹر، روبوٹ اور راکٹ کا دور ہے۔ لائف کتنی فاسٹ ہو گئی ہے۔"

"لائف فاسٹ ہو گئی ہے؟ ہونہہ، کاش میں رمیش کو بتاتا کہ پچھلے بیس سال سے میری لائف کتنی سُلو (slow) ہے۔ میری زندگی کی گاڑی بس رینگ رہی ہے، یہ بھی میرا کتنا بڑا المیہ ہے کہ راکٹ اور کمپیوٹر کے دور میں بھی میری زندگی کی رفتار اس قدر دھیمی ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے، میں نے کتنی کوششیں کیں کہ میری زندگی کی گاڑی بھی راکٹ کی رفتار سے نہ سہی، سوپر فاسٹ ٹرین کی رفتار سے آگے بڑھے، اسے تیز سے تیز کر دوں، لیکن چند قدم کا فاصلہ طے کرنے کے بعد مڑ کر دیکھتا ہوں تو خود کو وہیں پاتا ہوں، جہاں سے میں نے سفر شروع کیا تھا۔ بیوی، چار بچے، بوڑھی ماں، جوان بہن، کہنے کو تو ایک چھوٹا خاندان، لیکن ان کی ضرورتوں اور خواہشوں کا بھاری بوجھ میرے قدم آگے بڑھنے نہیں دیتے...... ماں پچھلے دو سال سے مسلسل بیمار ہے۔ جب کبھی اس کی طبیعت زیادہ بگڑتی ہے تو اگلے ماہ کی تنخواہ ملنے پر کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھانے کا وعدہ کرتا ہوں اور وٹامن کی چھوٹی موٹی لال پیلی گولیوں سے علاج کم اور تشفی زیادہ کرانے کی کوشش کراتا ہوں۔

"ان گولیوں سے اب تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی ماں۔" لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ ان گولیوں

سے کبھی اچھی نہیں ہو گی، اس لئے کہ یہ گولیاں اس کی بیماری کا علاج نہیں، جوان بہن کے ہاتھ جلد پیلے کرا دینا کا وعدہ کرتا ہوں، لیکن میں سمجھتا ہوں اور میری بہن بھی سمجھتی ہے کہ جسم ڈھانکنے کے لئے میں جسے ایک دوپٹہ کئی ماہ سے نہیں مہیا کر پا رہا ہوں تو ہاتھ پیلے کرنے کے لئے دس، بیس ہزار کے جہیز کا مطالبہ کس طرح پورا کر سکوں گا ـــــ بیوی کی اداس اور خاموش نگاہیں کہنے کو بہت کچھ کہتی ہیں، اور میں جان کر بھی انجان بنا رہتا ہوں ...

"انور بابو، بڑے صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔" چپراسی کی آواز مجھے چونکنے پر مجبور کر دیتی ہے، رمیش سامنے بیٹھا اکیسویں صدی میں داخلے والے مضمون میں پوری طرح کھویا ہوا تھا، میں تیزی سے اُٹھا اور بڑے صاحب کے چیمبر میں داخل ہوا۔

"انور، دیکھو یہ ایک لاکھ روپئے کا چیک ہے، اسے ڈراوٹ ریلیف فنڈ (Drohght Relief Fund) کے لئے روانہ کر دو اور اس فنڈ کی خبر تمام اخباروں میں بھیج دو کہ میں نے خشک سالی سے متاثرہ افراد کی راحت کے لئے ڈراوٹ ریلیف فنڈ میں ایک لاکھ روپے کا ڈونیشن دیا ہے۔"

"جی سر، ابھی یہ کام کئے دیتا ہوں۔" میں یہ کہتا ہوا باس کے چیمبر سے باہر آتا ہوں اور اپنی سیٹ پر بیٹھ کر چیک کو رجسٹرڈ ڈاک کے حوالے کرنے اور اخباروں کے لئے خبر بنانے میں مصروف ہو جاتا ہوں۔

میرا قلم کاغذ پر چل رہا تھا اور ذہن زندگی کی حقیقتوں کے تلاطم میں ڈوب ابھر رہا تھا ....

ایک لاکھ روپئے کا چیک سوکھے سے متاثرہ افراد کے لئے، اس کی پبلسٹی اور ایک لاکھ سے چار لاکھ کا ٹنڈر، اسے کہتے ہیں بزنس ..... کاش کسی کو یہ معلوم ہوتا کہ میرے گھر کے اندر برسوں سے کتنا زبردست سوکھا پڑا ہوا ہے ـــــ میرے گھر کے لوگوں کے چہرے اور ان کی آنکھوں سے ہر پل سوکھا جھانکتا رہتا ہے، گھر کا آنگن، برتن، در و دیوار سب کچھ سوکھا سے متاثر ہے لیکن میرے گھر کا سوکھا تو ایسا ہے جو ہریالی سے ڈھکا ہے، ببول کی ہریالی کے

نیچے صحرائی زمین اپنے اوپر کتنا بوجھ لئے ہوئے ہے، اس کی فکر کون کرے۔

"ارے یار انور، پانچ بج گئے، کیا ارادہ ہے۔"

"ہاں، ہاں چل رہا ہوں رمیش۔" چپراسی کو بلا کر سپرد ڈاک کرنے کے لئے کئی لفافے دیئے اور اپنا پرانا بوسیدہ تھیلا اٹھاتا ہوا رمیش کے ساتھ آفس سے باہر نکل گیا۔

ہر روز کی طرح، آج بھی بس اسٹینڈ کی جانب بڑھا اور رمیش نہرو پارک کی طرف۔

"رمیش تم یہ ہر روز پارک کیوں جاتے ہو کیا تمہیں گھر جلد پہنچنے کی خواہش نہیں ہوتی؟"

"ارے یار، بس یونہی۔"

"نہیں رمیش پلیز، آج یہ معمہ بھی حل کر ہی دو۔"

"میں ہر روز اس بات پر غور کرتا ہوں کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو......؟" میری باتیں سن کر رمیش کی آنکھوں میں ایک عجیب سی اُداسی چھاگئی، چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولا ـــــ

"دراصل میں اتنی جلدی گھر جاکر اپنے لوگوں کی سوالیہ نظروں کا شکار ہونا نہیں چاہتا۔ رات گئے گھر پہنچ کر پھر تو بکھر جانا ہی ہے۔"

رمیش کی بات سن کر میں کچھ دیر خاموش رہا، پھر دھیرے سے بولا، چلو یار میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں ـــ!

ـــــــــ ⁘ ـــــــــ

اسٹار وار

صبح سویرے ہی منگلورام گاؤں سے شہر کی جانب چل پڑا تھا۔ آج اسے شہر پہنچ کر پانچ بورے چاول فروخت کرکے ضروریات کا سامان خریدنا تھا۔

بیل گاڑی مدھم چال سے چلی جارہی تھی۔ منگلورام کے سامنے سورج جیسے جیسے اوپر اٹھ رہا تھا، ویسے ویسے اس کے ہاتھ بیلوں کی پیٹھ پر چابک برسا رہے تھے، زبان بھی اسی رفتار سے چل رہی تھی.... "ہیا ..... ہیا ..... چل .... سسرا تیہن ......" بیل چابک کی مار کھاکر دس بیس قدم بڑی تیزی سے چلتے، اس کے بعد وہ پھر اپنی پہلی والی رفتار پر آجاتے....

.....اسی وقت منگلورام کے سر کے اوپر سے ایک بے آواز طیارہ دھوئیں کی لکیر چھوڑتا ہوا، برق رفتاری سے گذر گیا، تو منگلورام کو عجیب سا لگا اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا___

"اے گورا کتوا پر کا آدمن ہئی، جے کہاں سے کہاں نکل گیلئی، اے گو ہم ہیؤ، جے بھور کنھی سے چلّے ہیا اور دوؤ گھنٹو میں دو کوس نہ آگے بڑھ لی......" اور اس کے ہاتھ پہلے کی طرح پھر چابک برسانے لگتے، سڑاپ .... سڑاپ ..... سڑاپ کی آواز بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی آواز میں کبھی دب جاتی اور کبھی ابھر جاتی، لیکن منگلورام کی ہو ہو.... ہاہا .... چلا .... چلا .... کی صدا برابر سنائی دیتی۔

دس بجتے بجتے وہ بازار پہنچ گیا۔ گدام میں اس نے مول تول کر کے چاول فروخت کئے اور ضروریات کا سامان خریدنے کے لئے اِدھر اُدھر کا چکر لگانے لگا۔

بازار میں مختلف دوکانوں کا چکر لگاتے ہوئے اس نے ایک بات بڑی شدت سے محسوس کی کہ ہر طرف امن و شانتی کی باتیں کی جا رہی تھیں۔ لوگ آپس میں نہ جانے کیا کیا باتیں کر رہے تھے۔ آئرلینڈ میں دو بڑی طاقتوں کے سربراہوں کی چوٹی کانفرنس سے اب پوری دنیا کے لوگ اسٹار وار سے محفوظ رہیں گے۔ اسلحہ کی ہوڑ ختم ہو جائے گی، ریگن اور گورباچیوف کے درمیان ضرور معاہدہ ہو جائے گا اور پوری دنیا میں امن و شانتی کی فضا قائم ہو جائے گی۔ موت کے منڈلاتے بادل ختم ہو جائیں گے اور ..... اور .....

ان تمام باتوں میں صرف ایک بات اس کے پلّے پڑی' امن و شانتی کی۔ اس کے چھوٹے سے ذہن میں یہ بات سما گئی کہ امن و شانتی کی باتیں کی جا رہی ہیں اور لوگ بے حد پُر امید ہیں۔ اس بات سے اسے ایک انجانی سی خوشی محسوس ہوئی ــــ شام کے وقت جب وہ گاؤں واپس ہونے لگا' تو وہ بہت خوش تھا .... اس کی نظروں کے سامنے اس کے اوپر آئے دن مظالم ڈھانے والے' بات بات پر گالیاں دینے اور جان سے مار ڈالنے کی دھمکیاں دینے والے بڑے کسان نرم پڑتے نظر آنے لگے۔ اس نے تصوّر کی آنکھوں سے دیکھا کہ گاؤں کا بدمعاش اور دولت مند کسان بنواری لال اسے گلے لگا رہا ہے اور کہہ رہا ہے ــــ " ارے منگلوا' اب تورا کوئی پھکر کرنے کی جرورت نا ہے' تو جب چاہے ہمرا کنواں سے پانی لے سکتا ہے' ہمرا گھر سے آجا سکتا ہے' تورا پر گاؤں میں اب کوئی روک ٹوک نا ہی ہے رے ...... منگلو رام خوشی میں بیلوں کی لگام کبھی زور سے کھینچتا کبھی ڈھیلا چھوڑ دیتا۔ منگلو رام کے اندر کا خوف جو برسوں سے سمایا ہوا تھا' دور بہت دور نکلتا ہوا محسوس ہونے لگا' ایک انجانی قوت اس کے اندر کے خوف کو ختم کئے دے رہی تھی اور وہ خود کو بڑا ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا' اس کی نظروں کے سامنے مختلف سمت میں فاختائیں اڑتی ہوئی نظر آنے لگیں۔

شام ڈھلتی جا رہی تھی، دن کا اُجالا دھیرے دھیرے تاریکی میں بدل رہا تھا۔ لیکن منگلو رام کو آج کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہوا۔ وہ بے فکری سے گنگناتا، گیت گاتا چلا جا رہا تھا۔

پورے چار گھنٹہ کی مسافت طے کرنے کے بعد اس کا گاؤں قریب آنے لگا، بازار سے واپسی میں آج اسے کافی دیر ہو گئی تھی، اس لئے گاؤں کے قریب پہنچتے پہنچتے اسے تقریباً دس بج گئے تھے۔ کچھ دیر کے لئے ننگی چاندنی کو کالے کالے بادلوں نے اپنی سیاہ چادر میں چھپا لیا تھا، اس لئے ہر طرف اندھیرے کا راج معلوم ہو رہا تھا۔ مسلسل چلتے چلتے منگلو نے کئی جھپکیاں بھی لے لی تھیں۔ گاؤں سے قریب پہنچنے کا اسے جب احساس ہوا تو اس نے اپنے گاؤں کی جانب ایک نظر ڈالی ـــــ اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا ـــــ "ارے ای کا۔" اور پھر اچانک اس کے اندر کا سکون و اطمینان ـــ بے چینی اور خوف میں بدل گیا۔ دیرے بیل گاڑی کے ایک کنارے پر رکھا چابک اس کے ہاتھ میں آ گیا اور سڑاپ۔ سڑاپ.... سڑاپ کی تیز آواز بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی ٹن ٹن ٹن کی آواز میں ڈوبنے اُبھرنے لگی۔ منگلو گاؤں کی جانب سے اُٹھتے ہوئے شعلوں کو دیکھ کر بڑا بے چین اور مضطرب ہو گیا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے گاؤں میں ہوئے پچھلے برس کا ایک بھیانک حادثہ گھوم رہا تھا۔ منگلو رام جیسے جیسے گاؤں کے قریب بڑھ رہا تھا ویسے ویسے اُٹھتے ہوئے شعلے آسمان کی طرف لپک رہے تھے۔

ابھی وہ گاؤں کے پہلے کنویں کے قریب ہی پہنچا تھا کہ بیل گاڑی سے کود پڑا، آگ کی لپٹوں کے ساتھ ساتھ فلک شگاف چیخ و پکار بھی اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ تقریباً دوڑنے لگا.... تیز.... بہت تیز...... اس کے قدم بڑی تیزی سے اُٹھتے ہوئے شعلوں کی جانب بڑھ رہے تھے اور جب وہ آسمان کو چھوتے ہوئے شعلوں کے قریب پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران اور ششدر رہ گیا کہ وہ خود اپنے ہی مکان کے قریب کھڑا ہے ـــ اس کی نظروں کے سامنے اس کا مکان دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ مکان کے آس پاس سے انسانی چیخ و پکار آسمان میں شگاف ڈال رہی تھی.... وہ دیوانہ وار اپنے مکان کی جانب بڑھا، ابھی وہ جلتے ہوئے مکان کے قریب

ہی پہنچا تھا کہ اندھیرے سے دو گولیاں چلیں اور منگلو رام کی چیخ بھی پہلی والی چیخوں میں شامل ہوگئی۔

دوسرے دن منگلو رام کے خاکستر مکان کے گرد پولیس اور اعلیٰ افسران کی بھیڑ اکٹھا تھی۔ ایک جونیئر آفیسر اپنے سینئر آفیسر کو رات میں پیش آنے والے حادثے کی تفصیل بتا رہا تھا۔ پریس رپورٹروں کے قلم اور پریس فوٹو گرافروں کے کیمرے بڑی تیزی سے چل رہے تھے۔

تیسرے دن تمام اخبارات کے صفحۂ اوّل پر منگلو رام اور اس کے خاندان کے دس افراد کی جلی ہوئی لاشوں کی تصاویر کے ساتھ ساتھ طبقاتی کشمکش اور اس کے ہولناک نتائج کی روداد شائع ہوئی تھی۔

اسی روز ریڈیو، اور ٹیلی ویژن آئر لینڈ میں دو بڑی طاقتوں کے درمیان ہوئی کانفرنس کی ناکامی پر اہم شخصیتوں کے بیانات اور مستقبل میں اسٹار وار کے خوف کی تفصیلات نشر کر رہے تھے ــــ اور منگلو رام کے گاؤں میں فاختاؤں پر خونی درندے جھپٹ رہے تھے اور چمگادڑیں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔

مایاجال

اب وہ ویسا نہیں تھا، جیسا یہاں آنے سے قبل تھا۔ اس کے اندر کئی تبدیلیاں آچکی تھیں اور اہم بات یہ تھی کہ اسے اپنی تبدیلی کا کوئی احساس نہ تھا۔ اگر اسے احساس تھا تو بس اس بات کا کہ اب وہ بہت بڑا آدمی بن چکا ہے۔ اب لوگ اس کا احترام کرتے ہیں، جلسوں، پارٹیوں، اسکولوں اور کالجوں میں اُسے اونچی کرسی پیش کی جاتی ہے۔ صدارت سونپی جاتی ہے۔ چیف گیسٹ بنایا جاتا ہے۔

گاؤں سے شہر کا سفر — یاد آتے ہی اس کے سوکھتے زخم کی پرتیں ادھڑ جاتی ہیں، اور وہ لہولہان ہو جاتا ہے۔

اس کی مفلسی، پریشانی، بے بسی، ماں کی مفلوک الحالی اور کنواری بہن کی جوانی نے اسے اس سفر کے لئے مجبور کیا تھا۔

جس دن وہ اپنے گاؤں کو بوجھل دل اور نم آنکھوں سے الوداع کہہ رہا تھا، اُس دن اس کی ماں کھاٹ پر پڑی مستقل کھانس رہی تھی، جوان کنواری بہن کے جسم پر چیتھڑے جھول رہے تھے اور وہ سرد چولہے کے قریب فکر مند آنکھوں اور اداس چہرے کے ساتھ بیٹھی تھی۔

گھر سے نکل کر وہ گاؤں سے ریلوے اسٹیشن کی جانب جانے والی پگڈنڈی پر آ گیا

اور راستے میں پڑنے والے پُل کے نیچے بے اختیار اُترتا چلا گیا اور اس جگہ رُک گیا' جہاں اس کا بوڑھا لاغر اور تپ دق سے کھانستے کھانستے مرنے والے باپ کا شمشان تھا۔ کئی منٹ تک وہ وہاں کھڑا رہا۔ تب اسے ایسا محسوس ہوا' جیسے اس کے باپ کی شبیہہ اُبھر رہی ہے۔ پھر وہ شبیہہ واضح ہوتی گئی۔ ــ اسے ایسا لگا' جیسے اس کے سامنے اس کا باپ کھڑا ہے ــ اور اسے گویائی مل گئی ہے ــ وہ کہہ رہا ہے۔ بیٹا تو شہر کی اور جا رہا ہے ــ جا ــ ضرور جا ــ میں تو جیون بھر آشاؤں کے سہارے جیتا رہا کہ کبھی تو بھاگیہ بدلیں گے، کبھی تو گریبی دور ہوگی ــ لیکن ــ تو نے دیکھا ہی ہے بیٹا کہ میں نے کس طرح کشٹ جھیل کر دن کاٹے اور آخری سمئے میں بھی ایڑیاں رگڑنی پڑیں ــ نہ خود آرام سے جیا' نہ تم لوگوں کو آرام دیا۔ اب تو ہی ان کے لئے کچھ کر ــ اسی سے میری آتما کو شانتی ملے گی ــ جا ــ میرا آشیرواد تیرے ساتھ ہے۔"

باپ کی باتوں نے اس کے ارادے کو مستحکم کر دیا اور وہ ریلوے اسٹیشن کی جانب تیز تیز قدموں سے بڑھنے لگا۔ شہر پہنچ کر خوب روپئے کماؤں گا، ماں کا علاج کراؤں گا، اسے ساری خوشیاں دوں گا، بہن کی خوب اچھی جگہ شادی کراؤں گا' پتاجی کا شرادھ کراؤں گا۔ اور.... اور ..... رکمنی ..... رکمنی کا خیال آتے ہی وہ ایک بار پھر اُداس ہوگیا ــ گاؤں چھوڑتے وقت اس سے ملا تک نہیں۔ اسے معلوم ہوتا کہ وہ گاؤں چھوڑ رہا ہے تو وہ بہت روتی اور اس کے رونے سے ممکن تھا کہ اس کا ارادہ بدل جاتا۔ اس نے سوچا ــ خوب روپئے کما کر جب گاؤں واپس آؤں گا' تو رکمنی سے شادی کرلوں گا ــ وہ میرا انتظار کرے گی۔ زندگی بھر انتظار کرے گی۔

شہر پہنچ کر وہ بھیڑ میں گم ہوگیا، جدھر بھی اس کی نظریں اُٹھتیں، بھیڑ ہی بھیڑ نظر آتی۔ ــ اتنی بھیڑ ــ اتنے لوگ ــ لیکن ہر کوئی ایک دوسرے سے لاتعلق ــ اپنی اپنی دُھن میں گُم ــ

اسے کچھ عجیب سا لگا ــ گاؤں کی کُھلی کُھلی فضا، سکون اور اطمینان کا یہاں دُور دُور تک پتا نہ تھا۔ وہ ایک کنارے کھڑا ہو کر سوچنے لگا ــ لیکن اسے ٹھیک سے کھڑا ہونا

بھی نصیب نہیں ہوا۔ اور وہ بھیڑ کے ایک ریلے سے بکھر بکھیڑ میں تھا خود بخود ـــــ اس کی جیب خالی تھی، جیسے امیروں کا گھر خلوص اور محبت سے خالی ہوتا ہے۔ بھوک آہستہ آہستہ شدت اختیار کرنے لگی ـــ کئی گھنٹے اس نے اپنے پیٹ میں پانی بھر بھر کر اس آگ کو بجھانے کی کوشش کی۔ لیکن اب اس کی قوت برداشت جواب دے رہی تھی ـــــ سامنے فٹ پاتھ پر ایک کھانے پینے کے سامان سے بھرا اسٹال تھا۔ وہ اس کے مالک کے پاس گیا ـــ اپنی مجبوری بتائی ـــ مالک نے اسے غصّہ بھری نظروں سے دیکھا اور جھڑکتے ہوئے کہا ـــ

"جا جا ـــ یہ کوئی انا تھالے نہیں ہے۔"

وہ اپنا منھ لے کر رہ گیا ـــ پیٹ کی آگ بڑھتی جا رہی تھی ـــ اُس نے کئی لوگوں سے التجا کی۔ لیکن ہر شخص نے دھتکار دیا ـــ وہ لوگوں کی منّت سماجت اور گذارش کرتے کرتے تھک گیا۔ بھوک بڑھتی گئی، وہ نڈھال ہونے لگا۔ قریب تھا کہ وہ بھوک کی شدت سے بیہوش ہو جاتا کہ اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کے اندر سے کوئی چیز نکل کر پھُر سے اُڑ گئی۔ اس نے نظریں اوپر کیں، تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک فاختہ آسمان کی وسعتوں میں گُم ہو رہی ہے۔ اور ـــــ اس کے بعد ـــ اس نے اپنے دل، دماغ، ذہن، مزاج میں ایک عجیب سی تبدیلی محسوس کی اور وہ ایک نئی قوت کے سہارے کھڑا ہو گیا ـــ اسے کسی نے بتایا کہ یہاں لوگ اپنا خون فروخت کر کے بھی روپیہ حاصل کرتے ہیں ـــ اور اس نے اپنا خون بیچ کر اپنے پیٹ کی آگ بجھائی۔ آٹو رکشا کے ایک ڈرائیور راموکا کا نے اسے شہر میں جینے کا گُر سکھایا، چکنی، شفاف اور اوبڑ کھابڑ راستوں پر چلنے کا طریقہ بتایا ـــ اور وہ آہستہ آہستہ ان راستوں پر چلنے لگا۔ وقت گذرتا رہا ـــ جس بھیڑ کو دیکھ کر اسے وحشت ہوتی تھی، اسی بھیڑ میں اسے سکون اور اطمینان ملنے لگا۔ سنیما ہال کے آس پاس کی بھیڑ، بازار کی بھیڑ، ریلوے اسٹیشن کی بھیڑ ـــ بھیڑ ـــ بھیڑ ـــ اور ان ہی بھیڑوں میں اس کا وقت گذرنے لگا۔ بھیڑ سے جب وہ نکلتا تو اس کے چہرے پر بھی ویسا ہی سکون، اطمینان، طمانیت اور آسودگی ہوتی ـــــ، جو ریس کورس میں جیتے ہوئے گھوڑے کے مالک

کے چہرے پر ہوتی ہے۔

شہر کی بھیڑ نے بہت جلد اسے وہ سب کچھ دے دیا، جس کے لئے وہ یہاں آیا تھا۔ لیکن یہ بھیڑ آہستہ آہستہ اس کی عادت اور پھر مجبوری بنتی گئی۔ گاؤں کو وہ بھول گیا۔ کبھی بھولے سے یاد آجاتی تو وہ منی آرڈر کرنا نہیں بھولتا۔

شہر کی بھیڑ نے آہستہ آہستہ اسے بے حد مصروف کر دیا۔ صبح سے شام اور شام سے رات کیسے گذر جاتی، اسے اس کا پتہ ہی نہیں چلتا۔

رات کے پچھلے پہر جب وہ نرم نرم بستر پر ہوتا اور رینا، ماریا یا کوئی اور... تھک کر سو جاتی تو کبھی چپکے سے اس کے دل پر کوئی دستک دیتی تو وہ بے چین ہو کر بستر پر بیٹھ جاتا، انگلیوں کے درمیان سلگتی سگریٹ کا آخری کش لے کر سگریٹ کو زمین پر پھینک دیتا، پھر اس کے قریب جاتا اور پیروں میں پڑی سلیپر سے مسلنے لگتا، مسلتا رہتا، مسلتا رہتا، سگریٹ میں دبی چنگاری کب کی بجھ چکی ہوتی، لیکن وہ اسے مسلسل مسلتا رہتا، یہاں تک کہ سگریٹ ریزہ ریزہ ہو جاتی اور پھر وہ شراب میں ڈوب جاتا۔

دوسری صبح ہوتی اور زندگی کا رقص شروع ہو جاتا اور وہ اس میں کھو جاتا۔ کوئی اپوائنمنٹ کنٹریکٹ، بورڈ آف ڈائرکٹرز کی میٹنگ ـــ اور پھر شام کی رنگینیاں... گورے آئے سیاست داں، بزنس مین اور شہر کے دوسرے رئیسوں کے ساتھ شراب کی چسکیاں ـــ تقریباً یہی روزانہ کا معمول بن گیا تھا ـــ شراب کی چسکیوں کے دوران اس کے ایک ایم۔ پی دوست نے ایک دن اس سے پوچھا ـــ "سنا ہے آپ کا تعلق کسی گاؤں سے ہے، پھر آپ کبھی جاتے نہیں۔"

جواب میں وہ کچھ دیر چھت تکتا رہا پھر بولا ـــ "گاؤں ـــ جی گاؤں سے تو تعلق ہے ہی میرا۔ لیکن وہاں جا کر کروں گا کیا، وہاں بھوک، مفلسی، مفلوک الحالی، بے بسی، کڑواہٹیں، گھٹن اور مجبوریوں کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔"

"لیکن ایک بات ہے کہ گاؤں میں جو سکون اور اطمینان ہے وہ یہاں نہیں ہے۔"

"ہاں، ٹھیک ہے، لیکن یہ سکون اور اطمینان اسی وقت محسوس کیا جاسکتا ہے شرما جی، جب پیٹ بھرا ہو۔"

"جی ہاں، یہ آپ صحیح فرما رہے ہیں۔"

پھر گلاسوں میں نئی شراب ڈھالی جاتی اور موضوع بھی بدل جاتے۔

کئی سال گذر گئے۔ مدن کمار کروڑوں کا مالک بن گیا۔ دولت اور عزت اس کے قدم چوم رہی تھی۔ صبح سے رات تک — مصروفیت، نئے پرانے چہروں سے ملاقات، کار اور ہوائی جہاز کا سفر — تصنع، دکھاوا، جھوٹ، فریب اور دھوکہ کی زندگی، ہر آدمی کو وہ دھوکہ دے رہا تھا، لوگ اسے دھوکہ دے رہے تھے — لیکن — اس کی بدولت اس کے حصے میں دولت آرہی تھی۔ اب وہ گاؤں کا بھولا بھالا معصوم سا مدنا نہیں تھا۔ بلکہ مدنا سے مدن، مدن سے مدن باس اور اب وہ مسٹر مدن کمار تھا۔

کبھی کبھی وہ محسوس کرتا کہ اس کا دل، دماغ بدلنے کے ساتھ اس کے چہرے پر بھی کئی چہرے اُگ آئے ہیں۔ مختلف لوگوں سے ملتے وقت، اس کا چہرہ بھی مختلف ہو جاتا ہے۔ ان سے بات کرنے کا ڈھنگ اور ملنے کا انداز بھی بدل جاتا ہے۔ سوچا، وہ اپنا سب کچھ کھو چکا ہے۔ دولت کی چکا چوند میں خود اس کا وجود گُم ہو چکا ہے۔

لیکن ایسی دولت بھی کس کام کی، نہ ذہنی سکون ہے نہ قلبی اطمینان اور ادھر مسلسل اسے ماں، بہن اور رکمنی کی یادیں ستا رہی تھیں۔ گاؤں کا پُرسکون ماحول، آم کے پیڑوں کی چھاؤں، رہٹ کا شیتل پانی، صاف ستھری ہوائیں، ہر طرف پھیلی ہریالی — ماں کی دی ہوئی مڑوا کی روٹی اور پیاز، بہن کا راکھی بندھن کے وقت، اس کی پیاری سی مُسکان — وہ سب کچھ بھول چکا، وہ سب کچھ کھو چکا ہے۔

اچانک ایک دن اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس دولت کی جگمگاتی دنیا کو چھوڑ دے گا۔ جہاں ہر پل، ہر لمحہ میٹھا زہر پینا پڑتا ہے۔ سکون، اطمینان کی جگہ اذیت، درد، کرب، گھٹن

بے کیفی کے سوا کچھ نہیں، دولت سے ماں کی ممتا، بہن کا پیار اور رکمنی کی بے لوث محبت وہ نہیں خرید سکتا۔

اس نے اپنے سکریٹری کو بلا کر کہا ——" میں گاؤں جا رہا ہوں۔ کب آؤں گا، یہ نہیں کہہ سکتا۔"

"لیکن سر، ۲ تاریخ کو ۲۶ لاکھ کا کنٹریکٹ ہے، اس میں آپ کا رہنا ضروری ہے۔ پرسوں رویا فرم کے شیئر ہولڈرز کی میٹنگ ہے۔ اس میں آپ نہیں رہے تو کئی لاکھ کا نقصان ہو جائے گا۔ کل سپلائی منسٹر آ رہے ہیں، ان سے آپ کا اپوائنٹمنٹ ہے، ان سے ملنا بھی ضروری ہے۔"

سکریٹری کی باتیں سن کر مدن کچھ سوچتا رہا، خلا میں گھورتا رہا۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور چند لمحوں بعد سوٹ کیس کھولنے لگا۔ دیوار پر ایک کیڑا مکڑی کے جال میں پھڑپھڑا رہا تھا۔

—— ❖ ——

زنجیر

پانچ برس کے طویل عرصہ کے بعد آج اچانک غزالہ کا خط دیکھ کر رخسانہ حیرت زدہ رہ گئی۔ ایسی کیا خاص بات ہوئی کہ اس نے مجھے یاد کیا۔ رخسانہ نے سوچا اور خط کھول کر جلدی جلدی پڑھنے لگی۔ غزالہ نے لکھا تھا!

ڈیر رخسانہ!

آج تقریباً پانچ برسوں بعد تم میرا خط دیکھ کر ضرور حیران ہوگی، حیرانی تو مجھے بھی ہے کہ پانچ برسوں بعد آج تم ہی مجھے اس شدت سے کیوں یاد آرہی ہو ـــــ شاید اس لئے کہ پچھلے ایک سال سے جیسی درد و کرب اور گھٹن کی زندگی میں جی رہی ہوں، ان کا اظہار کر کے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔ ورنہ میں گھُٹ گھُٹ کر مر جاؤں گی، میں اپنا دُکھڑا سناؤں بھی تو کسے، میرا کوئی ہمراز و غم گسار نہیں تمہارے سوا، سبھی اپنی اپنی دنیا میں گُم ہیں۔ اماں، ابا یہ سوچ کر خوش ہیں کہ انہوں نے لاکھوں میں کھیلنے والے شخص کے سپرد کر کے سارے جہاں کی خوشیاں دلادی ہیں۔ لیکن میری حیثیت ـــ سونے چاندی کے پنجرے میں قید کسی معصوم پَر کترے پرندہ جیسی ہے جسے ساری آسائشیں مہیا ہیں، لیکن وہ اپنی زندگی نہیں جی سکتا۔ میری ہنسی، میرے قہقہے تو اسی دن ختم ہوگئے جس دن ارشد کو زبردستی ان کے

بھائیوں نے ذہنی توازن کھو جانے کا بہانہ بنا کر پاگل خانہ میں داخل کرا دیا تھا۔ لیکن سچ کہتی ہوں رخسانہ کہ ارشد پاگل نہیں ہوئے تھے، بلکہ وہ ذہنی طور پر اپنے چھوٹے بھائیوں کی بدسلوکیوں سے بے حد پریشان تھے۔ ارشد چاہتے تھے کہ جس طرح انھوں نے اپنے چھوٹے بھائیوں کو محبت دی ہے، ان کا خیال رکھا ہے، ان کے چھوٹے بھائی بھی ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک کریں۔ لیکن یہ ارشد کی واقعی بدنصیبی تھی کہ انھوں نے جن جن لوگوں کو اپنا سمجھا، پیار و محبت دیا۔ بدلے میں ان کے حصّے میں نفرت ہی ملی ــــــ انہیں اس کا بڑا دُکھ تھا ــــ اور اُس دن اُن کے صبر و ضبط کا باندھ ٹوٹ گیا، جس دن ان کی مرضی کے بغیر ان کے آبائی مکان کو جس سے ارشد کا بڑا جذباتی اور والہانہ لگاؤ تھا، فروخت کر دیا گیا۔ اس بات کا ارشد کو بڑا گہرا صدمہ ہوا ــ مکان بکنے کی اطلاع پا کر اس روز وہ پھوٹ پھوٹ کر بچّوں کی طرح رو دئے تھے ــ میں نے انھیں سمجھانا چاہا تھا کہ آپ اس پُرانے مکان کا غم کیوں کرتے ہیں جبکہ آپ نے زمین بھی خرید لی ہے۔ لون لیکر مکان بنوا لیجئے گا۔ لیکن ان کا کہنا تھا کہ "جس مکان کی اوبڑ کھابڑ زمین نے مجھے اپنے سینے پر کِھلایا ہے، جس مکان کی ایک ایک اینٹ میرے لمس سے آشنا ہے اور یہ لمس کتنی کہانیاں دہراتے ہیں، وہ مکان تو مجھے نہیں ملے گا نہ ــ ارشد رات بھر سوئے نہیں تھے، سگریٹ پی پی کر انھوں نے صبح کی اور صبح ہوتے ہی وہ پہلی بار، ہاں بالکل پہلی بار، اپنے بھائیوں پر غصّے میں برس پڑے تھے ــ اور غصے کے عالم میں اپنے ہی بال نوچنا شروع کر دیا تھا، اپنے کپڑے تار تار کر ڈالے تھے ــ پڑوسیوں نے انھیں دبوچ لیا اور بھائیوں کے مشورہ سے انہیں زبردستی پاگل خانہ پہنچا دیا ــ

ارشد پاگل خانہ چلے گئے اور ساتھ میں میری خوشیاں، ہنسی، قہقہے، سکھ، چین، آرام سب کچھ لے گئے۔ تمہیں تو معلوم ہے رخسانہ کہ ارشد سے میں نے شادی والدین کی مرضی کے خلاف اپنی خوشی سے کی تھی۔ والد نے بہت چاہا تھا کہ میں ارشد کے بجائے کسی بڑے آدمی کے گھر کی بہو بنوں، لیکن مجھے یہ منظور نہ تھا، ارشد ہی میرے آئیڈیل تھے اور میں نے سبھوں کی مخالفت

کے باوجود شادی کی اور شادی کے بعد میں خوش تھی۔ میں کیا، ارشد بھی بے حد خوش تھے۔
اور ہم دونوں ہی اپنی اپنی خوش نصیبی پر ناز کرتے تھے۔ ہم دونوں کے مزاج میں بڑی ہم آہنگی تھی
جو وہ چاہتے تھے، وہی میری خواہش ہوتی تھی۔ حالانکہ وہ ایک کالج میں لکچرر تھے اور آمدنی محدود
تھی، لیکن اس محدود آمدنی میں بھی ہم دونوں بے حد خوش تھے۔ انہیں شعر و شاعری کا بہت
شوق تھا۔ اکثر شام کے وقت ہم دونوں ادب اور دوسرے موضوعات پر گھنٹوں گفتگو کرتے، ان کا
مطالعہ بھی گہرا تھا۔ جب بھی وہ کسی موضوع پر بولتے تو لگتا تھا کہ وہ اس موضوع کے ماہر ہیں۔
میری باتیں بھی وہ بہت غور سے سنتے اور اگر کبھی مجھ سے کوئی غلطی ہو جاتی تو وہ بڑے پیار سے
سمجھانے کی کوشش کرتے۔ میں ارشد کے ساتھ اتنی خوش تھی کہ بیان کرنے کو الفاظ نہیں
لیکن ہماری خوشی اور ہم دونوں کی والہانہ محبت کو کسی کی نظر لگ گئی۔

ارشد کو پاگل خانے میں قیدی بنا دیا گیا، میرے والدین کو جب ارشد کے پاگل خانے
جانے کی اطلاع ملی تو انہیں موقع مل گیا اور وہ لوگ مجھے گھر لے گئے اور کچھ دنوں بعد میری مرضی کے
خلاف، زبردستی ارشد سے خلع کرا دیا۔ میرے والدین نے میرے احساسات و جذبات کا بھی خیال
نہیں رکھا، میرے انکار کو کچھ اور سمجھا گیا اور اس طرح میں ارشد جیسے چاہنے والے شوہر سے الگ
کردی گئی۔ اس دن میں چیخ چیخ کر رو دی تھی۔ لیکن میری چیخ و پکار کا بے حس لوگوں کے
دلوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ جیسے سب کے سب پتھر کے ہو گئے ہوں۔ میرے والدین کو میری
ظاہری خوشی کا بڑا خیال تھا اور اسی خیال کے تحت تجوری کے دروازے کھول دیئے گئے اور
میں ایک بار پھر دلھن بنی۔ جس دن میں دوبارہ دلھن بنی اس دن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ
میں سُرخ جوڑا نہیں بلکہ کفن پہن رہی ہوں اور کسی حد تک حقیقت بھی یہی تھی، اس لئے کہ
دوسری شادی، میرے لئے خوشیاں نہیں بلکہ درد و کرب اور گھٹن کا سبب بنی، میرا دوسرا شوہر
شہزاد، ارشد کے برعکس ہے۔ حالانکہ وہ ارشد کے مقابلہ میں زیادہ دولت مند ہے۔ موٹر پارٹس کے
بزنس میں اس کی روزانہ کی آمدنی دو تین ہزار روپے ہے۔ لیکن لوہے کے پارٹس پر زے بیچتے بیچتے

اس کا دل بھی لوہے کا بن گیا ہے۔ اسے اپنی بیوی کے احساسات و جذبات کی فکر نہیں رہتی' اگر فکر رہتی ہے تو بس اس بات کی کہ کیسے زیادہ سے زیادہ روپے کمایا جائے' شہزاد میں وہ سب کچھ نہیں ہے' جو ارشد میں تھا۔

میری زندگی جہنم بن گئی ہے۔ حالانکہ میرے والدین یہ سوچ کر بے حد خوش ہیں کہ انھوں نے اپنی لڑکی کی شادی ایک امیر شخص سے کی ہے ۔ لیکن رخسانہ ! دولت سے کہیں خوشیاں اور روحانی سکون خریدا جا سکتا ہے ؟

میں ارشد کو اب تک بھول نہیں سکی ہوں۔ اس کی محبت' اس کی چاہت' اس کا والہانہ لگاؤ یاد کر کے میں رو پڑتی ہوں۔ ارشد میرے دل' دماغ' ذہن بلکہ روح کی گہرائیوں میں بسے ہوئے ہیں۔ جب بھی میں تنہا ہوتی ہوں تو میں بے حد خوش رہتی ہوں' اس لئے کہ تنہائی میں میرے ساتھ ارشد کی یادیں ہوتی ہیں۔ اور میں شاید اسی لئے تنہائی پسند ہو گئی ہوں۔ شہزاد کو بھی اس سے کوئی مطلب نہیں ہوتا ہے کہ میں تنہا رہتی ہوں یا بھیڑ میں۔

ارشد کی ایک ایک بات مجھے یاد آتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی اس کا مذاق' اس کا چلبلاپن' اس کے لطیفے ـــــ اور انھیں یاد کر کے میں ہنس پڑتی ہوں۔ پژمردہ چہرے پر ہنسی دیکھ کر مجھے خود عجیب سا لگتا ہے۔ مجھے تنہائی میں ہنستے کوئی دیکھ لیتا تو' وہ شک کی نگاہ سے مجھے دیکھے۔ لگتا ہے کہ میں پاگل ہو گئی ہوں۔ کاش ایسا ہو جائے !

کل شام شافو آئی تھی مجھ سے ملنے۔ شافو میری پہلی سسرال کے پڑوس میں رہتی ہے اس نے ارشد کے بارے میں جو بات بتائی اسے سنکر میری روح تک کراہ اٹھی ہے۔ یا خدا' یہ کیا ہوا۔ میرے کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے مجھے۔

شافو نے بتایا کہ ارشد چھ ماہ بعد پاگل خانے سے واپس آ گئے تھے۔ ڈاکٹر نے رپورٹ میں لکھا تھا کہ ارشد کا دماغ خراب نہیں ہوا ہے بلکہ کسی گہرے صدمہ نے ذہنی طور پر انھیں پریشان کر دیا تھا ـــــ ارشد پاگل خانے سے گھر آئے اور آتے ہی مجھے تلاش

کرنا شروع کردیا اور جب انھیں ساری بات بتائی گئی، تو وہ چیخ پڑے ــــ "نہیں، میری غزالہ کو کوئی مجھ سے نہیں چھین سکتا، غزالہ میری ہے، وہ میری ہے، صرف میری ہے۔" اور چیختے چیختے گھنٹہ بھر بعد انہوں نے دیوانہ وار پتھر پھینکنا شروع کردیا۔ چیخنا، چلّانا شروع کردیا ــــ اب وہ واقعی پاگل ہو گئے ہیں۔

شافو، یہ سب کہہ کر گھر چلی گئی لیکن میرے دل، دماغ میں ایک طوفان چھوڑ گئی ــــ شافو کے جاتے ہی میں نے بکس میں سے ارشد کی تصویر نکالی اور اسے سینے سے لگالیا ــــ نہیں ارشد، میں نے تمہیں نہیں چھوڑا ہے، میں اب بھی تمہاری ہوں، میری روح کی گہرائیوں میں تم ہی تم ہو ــــ

میری عجیب کیفیت ہو رہی ہے، سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میرا دل، دماغ اُڑا اُڑا سا لگ رہا ہے، ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ برسوں سے ضبط کا باندھ آج ٹوٹ جائے گا ــــ کمرے کی ہر شے پر آج مجھے ارشد نظر آرہے ہیں اور ہر شئے کو اٹھا اٹھا کر میں چوم رہی ہوں۔ اسے باہنوں میں بھر رہی ہوں۔ اور اسے کوئی مجھ سے چھیننے کی کوشش کر رہا ہے، تو میں بھوکی شیرنی کی طرح اس پر جھپٹ رہی ہوں۔

رات کے تین بج رہے ہیں، نیند آنکھوں سے کوسوں دور ہے۔ اب اجازت دو۔ دیکھو، کیا ہونے والا ہے۔

تمہاری

غزالہ

غزالہ کی دردناک داستان پڑھ کر رخسانہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ یہ خط ایک ماہ قبل کا لکھا ہوا تھا جسے شہزاد نے پوسٹ کیا ہے، ساتھ میں ایک مختصر سی تحریر شہزاد کی بھی ہے جس میں اس نے لکھا ہے۔

"کچھ روز ہوئے آپ کی سہیلی غزالہ کو پاگل خانے میں داخل کر دیا گیا ہے"۔ ●●

دوپہر

گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں رامو اپنی پوری طاقت پیڈل پر ڈالتا ہوا رکشہ پر بیٹھے شخص کو اس کی منزل کی جانب لئے جا رہا تھا۔ کہیں بھیڑ دیکھتا تو گھنٹی بجانے لگتا اور بھیڑ کم نظر آتی تو کاندھے پر پڑے انگوچھے سے اپنے شرابور چہرے اور گردن سے پسینہ پونچھنے لگتا۔

"بس بائیں طرف روک دو۔"

سواری کی آواز سنتے ہی اس کے ہاتھ بے اختیار بریک پر گئے اور رکشہ چند قدم کے فاصلے پر رُک گیا۔

سوار اترا اور پاکٹ سے دو روپے کا ایک نوٹ نکال کر رامو کی طرف بڑھا دیا —— رامو نے انگوچھے سے پسینہ خشک کرتے ہوئے دو روپے کا نوٹ دیکھا اور اپنی احتجاج کو گڑگڑاہٹ میں بدلتے ہوئے بولا —— "بابو، اتنی دور سے —— اور دو روپیہ۔"

"ابے چپ —— لینا ہے تو لے ورنہ بھاگ۔"

"بابو، ایک گو اٹھنی اور دیئے دو۔"

"کہا نہ، اس سے زیادہ نہیں ملے گا۔ اور دو روپے کا نوٹ رکشہ کی سیٹ پر ڈال کر گالیاں بکتا ہوا سامنے کے "بلی پوائنٹ" میں وہ داخل ہو گیا۔ جہاں لوگ خشک گلے میں ٹھنڈے

مشروبات اتار کر فرحت پا رہے تھے۔

رامو نے اپنی بے بسی اور مجبور خاموشی کے ساتھ دو روپے اٹھالئے اور اس شخص کا نظروں سے تعاقب کیا ــــ اس نے دیکھا کہ وہ آدمی سامنے کھڑا "کولڈ ڈرنک" کی ایک بوتل ہاتھ میں لے کر اس کی ٹھنڈک کا اندازہ لگا رہا ہے اور یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ بوتل اتنی ٹھنڈی ہے کہ اسے منہ میں لگاتے ہی دیر سے خشک گلا نہ صرف تر ہو جائے گا، بلکہ جسم کے اندر اتر کر گرمی اور تکان کو بھی دور کر دے گا۔ اُس نے بوتل منہ سے لگالی۔

رامو، دھوپ میں کھڑا پسینہ خشک کرتے ہوئے اس آدمی اور اس کے ساتھ کئی دوسرے آدمی کو بوتل ہاتھ میں لیتے، پھٹاک سے بوتل کا منہ کھلتے اور پھر اسے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

اسے یاد آیا کہ پرسوں رکشہ میں بیٹھے ایک جوڑے نے اسی طرح کی دو بوتلیں اس سے منگوائی تھیں۔ دوکان سے بوتل لاتے ہوئے اس کے ہاتھوں نے کتنی ٹھنڈک محسوس کی تھی۔ اسے ایسا لگا جیسے ٹھنڈک اس کی کھُردری اور سخت ہتھیلیوں سے ہوتی ہوئی اس کے جسم کے اندر اُتر رہی ہے۔ اس کا جی چاہا وہ دونوں ٹھنڈی بوتلیں دیر تک اسی طرح اپنے ہاتھوں میں لئے رہے اور اس کی ٹھنڈک کو اپنی ہتھیلیوں سے اپنے جسم کے اندر اتار دے، لیکن وہ جیسے ہی بوتل لئے رکشہ کے قریب پہنچا، لڑکے اور لڑکی نے اس کے ہاتھ سے بوتلیں جھپٹ لیں اور منہ سے لگالیا۔ دونوں رامو کے احساسات و جذبات سے بے خبر کولڈ ڈرنک کو آہستہ آہستہ سِپ کرنے لگے اور اِدھر رامو ــــ للچائی نظروں سے ان دونوں کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے سوچ رہا تھا ــ "ایک دن ہم ہو بیئیب" (ایک دن میں بھی پیوں گا)

آج پھر اس کے سامنے بوتل کے کارک پھٹاک پھٹاک کھُل رہے تھے اور اس کی شیتلتا اور ٹھنڈک کو لوگ اپنے اپنے جسم کے اندر اتار رہے تھے۔ بوتل کی ٹھنڈک اور شیتلتا کو اس نے ایک بار پھر تصوّر میں اپنی ہتھیلیوں پر محسوس کیا۔ گرمی عروج پر تھی، ایسا

لگتا تھا جیسے سورج اب بس سوا نیزے پر آنے ہی والا ہے — پیاس کی شدت سے گلے میں کانٹے چبھ رہے تھے ۔ اس نے اپنے جسم پر جھولتے ہوئے چیتھڑے میں سے ایک بوسیدہ سا بٹوہ نکالا — اس وقت وہ اپنے گلے میں چبھتے ہوئے کانٹے کو اپنی اسی خواہش سے ختم کرنا چاہتا تھا۔ بٹوہ میں سے کل سات روپے نکلے — پانچ روپے اس نے رکشہ کے مالک کے "جمع" کے لئے رکھا ۔ اب دو روپے بچ رہے تھے ۔ دو روپے لے کر وہ فخر سے سینہ پھلائے، لیکن کچھ ہچکچاہٹ کے ساتھ "سلی پوائنٹ" میں داخل ہوا۔

" بابو، اے گو ٹھنڈا لکا بوتل ہمرا دیو۔" (بابو، ایک ٹھنڈی بوتل مجھے بھی دینا)

دوکان کے مالک نے ایک عجیب سی نظروں سے اس کے گندے، پسینہ سے شرابور اور بوسیدہ کپڑے اور جسم کو دیکھا اور غرّا کر پوچھا — " کیا تو پیئے گا ۔"

" ہاں، بابو بڑی گرم لگتے ہئی ۔" (ہاں، بابو بڑی گرمی لگ رہی ہے)

دوکان کا مالک اور وہاں پر کھڑے تمام لوگ ایکبارگی ہنس پڑے اور ان تمام لوگوں کی ہنسی سے رامو کو ایسا لگا جیسے اس کے جسم پر جھولتے ہوئے چیتھڑوں کو بھی ان لوگوں نے نوچ کر پھینک دیا ہو — ہنسی پر قابو پاتے ہوئے دوکان کے مالک نے کہا — " اچھا، لا، روپے ۔"

" ای — لو ۔" (یہ لو)

" ابے دو روپے میں ہی جہنم نما گرمی سے نجات چاہتا ہے ۔ تین روپے اور لا — تین روپے ۔"

" تین روپے — تین روپے تو ....."

" ابے پیسے نہیں ہیں، تو جا بھاگ ۔"

رامو بجھے ہوئے قدموں سے دوکان سے باہر نکل آیا ۔ وہ سوچنے لگا، پانچ روپے تو بہت ہوتے ہیں ۔ پانچ روپے میں تو سیر بھر آٹا مل جائے گا — آج نہیں پیوں گا ۔ شام تک روزانہ سے زیادہ کماؤں گا تب ٹھنڈی بوتل پیوں گا ۔" یہ سوچتا ہوا وہ رکشہ سے آگے بڑھ گیا۔

گرمی کی شدت سے جسم سلگ رہا تھا اور گلے میں کانٹے کی چبھن بڑھ گئی تھی ـــ کچھ دُور جانے پر اسے میونسپلٹی کا ایک نل نظر آیا، جس سے بوند بوند پانی ٹپک رہا تھا۔ اس نے نل کے گرم گرم پانی سے اپنے خشک گلے کو تر کیا ـــ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ خود کو یقین دلاتا رہا کہ ٹھنڈی بوتل پی کر اس کی ٹھنڈک اپنے جسم میں اُتارے گا ضرور ـــ نل پر سے اس نے گردن اُٹھائی تو دیکھا ایک شخص، اس کی مرضی جانے بغیر اُس کے رکشہ پر سوار ہے ـ وہ رکشہ کے قریب آیا اور سوار شخص سے منتیں کرنے لگا ـ بڑی جور بھوک لگی ہے بابو، کھائے لا جائی بھیا۔"

"نا، کیسے جائے گا، سالے چل نہیں تو دو تھپڑ دوں گا۔"

رامو نے خوف زدہ ہو کر جلدی سے رکشہ کے پیڈل پر اپنے پاؤں رکھ دئے۔

"کِنّے چلیو، بابو۔؟" (کدھر چلوں بابو؟)

"بھارت ٹاکیز۔"

اور رامو خالی پیٹ اور گرمی سے نڈھال ہونے کے باوجود اپنی باقی بچی ہوئی طاقت سے رکشہ دوڑانے لگا۔

دن بھر کولھو کے بیل کی طرح رکشہ میں جُتا رہنے کے بعد شام کو رکشہ مالک کو پانچ روپئے جمع دئے اور ایک کنارے بیٹھ کر دن بھر کی اپنی کمائی کا حساب لگانے لگا۔ سارے روپئے گننے کے بعد اس کی باچھیں کِھل گئیں۔ پورے بارہ روپئے بچ رہے تھے۔ کل سے آج اس نے دو روپئے زیادہ کمائے تھے۔ بنیا کی دوکان سے آٹا، دال، تیل، گُڑ، مصالحہ اور آلو وغیرہ لینے کے بعد اس کے پاس تین روپئے بچ رہے تھے۔ اسے بڑی خوشی محسوس ہوئی ـــ کل دو روپئے بچاؤں گا اور ٹھنڈی بوتل پیوں گا۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی وہ بازار آگیا اور رکشہ میں جُت گیا، سواریوں نے اسے دوپہر کو بس اسٹینڈ کے قریب کی جھگی میں بیٹھ کر ستّو بھی کھانے کا موقعہ نہ دیا۔ دن بھر کی سخت دھوپ اور تمازت نے اس کی کھوپڑی کو بھون ڈالا تھا ـ اور تمام دن وہ خود کو وہ یقین دلاتا

رہا تھا کہ آج وہ ٹھنڈی بوتل ضرور پیئے گا۔ ہاتھوں میں لے کر دیر تک اس کی ٹھنڈک محسوس کرے گا تب ہونٹوں سے لگائے گا۔

شام کے وقت جمع دینے کے بعد اس کے پاس پندرہ روپے بچے تھے۔ آٹا، چاول، دال، تیل، گڑ اور بیڑی وغیرہ لینے کے بعد اس کے پاس پورے پانچ روپے بچ گئے ــــ وہ بڑا خوش ہوا۔ آج اس کی دیرینہ آرزو پوری ہو گی ــ خوشی خوشی وہ ریلی پوائنٹ کی طرف بڑھنے لگا راستے بھر وہ تصور میں ٹھنڈی بوتل کو ہاتھ میں لیتا، اس کی ٹھنڈک کو ہتھیلیوں سے اپنے جسم کے پور پور میں اتارتا، پھر بوتل کو ہونٹوں پر رکھتا، پھر دھیرے دھیرے ــ پیتا۔ ٹھنڈک ہی ٹھنڈک ــ ایک سرور سی کیفیت ــــ خوشی سے جھومتا ہوا وہ دوکان کے قریب پہنچا ــ پہلا زینہ۔ دوسرا زینہ اور پھر کاؤنٹر ــ لیکن ابھی وہ اپنے بوسیدہ بٹوہ میں سے پانچ روپے نکال بھی نہ پایا تھا ــ کہ اچانک اس کے کانوں میں اس کی بیوی کی التجا گونجنے لگی۔

"ببوا کے دو دن سے بکھار لگل ہئی، آج اِکرا لا دوا جرور لے لی ہا۔" (ببوا کو دو دن سے بخار لگا ہے، آج اس کے لئے دوا ضرور لیتے آنا)

اور وہ جھٹ واپس مڑ گیا، دونوں زینہ اس نے ایک ساتھ طے کیا اور بھاگتا ہوا ہومیوپیتھ کے ڈاکٹر رام سروپ کے یہاں لائن میں لگ گیا۔

قہر ڈھاتی ہوئی گرمی اور دھوپ کو سائبان نے باہر ہی روک دیا تھا !!

ــــ ❖ ــــ

خاموش سایہ

صبح نو بجے تیار ہو کر کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اُٹھی ۔ ریسیور اٹھا کر میں نے جیسے ہی "ہیلو" کہا دوسری جانب سے ایک باوقار اور جانی پہچانی آواز اُبھری —

"قادری ہو جی ؟"

"جی انکل، سلام علیکم" ۔ آواز پہچانتے ہی میں نے سلام کیا۔

"کیا میاں، کہاں غائب رہتے ہو؟"

"ایک کام سے پٹنہ چلا گیا تھا ۔"

"تم ہمیشہ پٹنہ ہی میں رہتے ہو، تو وہیں مکان دکان کیوں نہیں بنوا لیتے ۔"

"انکل، خواہش تو میری بھی ہے کہ راجدھانی میں رہ کر راجدھانی کے فائدے اٹھاؤں، بس آپ دعا کریں ۔"

"ارے میاں، صرف دعا سے کام نہیں چلے گا، بلکہ .... اچھا خیر، تم ابھی کیا کر رہے ہو ۔"

"کوئی خاص کام نہیں انکل، بس ایک تبصرہ لکھ کر کاتب کے حوالے کرنا ہے ۔ پھر میں

فری ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے، تم ۱۱ بجے تک آجاؤ، تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ اور وہ فائل تمہارے حوالے کردوں گا، اب تم اس کا جو کرو، ویسے مجھے تم پر بھروسہ ہے، اب تک تو مجھے جو ملے، سبھوں نے دھوکا کے سوا دیا ہی کیا ہے۔ خیر چھوڑو، اِن باتوں کو، تم آؤ تو باتیں ہوں گی۔"

"بہت بہتر انکل، میں ۱۱ بجے تک ضرور حاضر ہوجاؤں گا۔" اور یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔ اور جلدی جلدی سارے کام نپٹانے لگا، تاکہ ۱۱ بجے ہر حالت میں انکل سے مل سکوں ـــ لیکن کام سے کام نکلتا گیا، کسی کی آمد، کسی کا فون، کسی کا کام ـــ ان ہی اُلجھنوں میں صبح سے شام ہوگئی، رات میں سوچا کہ فون کرکے انکل سے معذرت کرلوں، لیکن پھر سوچا کہ کل صبح سویرے ہی جاکر معذرت کرلونگا۔ اور ساری باتیں بھی ہوجائیں گی۔

لیکن صبح ـــ وہ صبح ایسی منحوس ہوگی، اس کا میں نے تصوّر بھی نہیں کیا تھا ـــ فون کی گھنٹی ہی سے میری نیند ٹوٹی، ہاتھ بڑھاکر ریسیور اٹھایا، تو دوسری طرف سے مسعود بھائی کی آواز اُبھری ـــ

"کچھ خبر ہے؟ آپ کے انکل ..... کا انتقال ہوگیا۔"

"نہیں۔" بے اختیار میرے منھ سے چیخ نکل گئی اور ریسیور ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

مجھے یقین نہیں آرہا تھا، ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ شاید مسعود بھائی نے غلط اطلاع دی ہے، آج، ..... آج تو مجھے ان سے ملنا ہے، کل نہیں آنے کا معذرت طلب کرنا ہے۔

میں ان کی رہائش گاہ کی جانب دوڑ پڑا، اور کوٹھی کے قریب پہنچ کر ٹھٹھک پڑا۔ ضرور کوئی انہونی ہوگئی ہے، تبھی تو آج یہ کوٹھی اداس اور سوگوار ہے۔ میں کوٹھی کے اندر داخل ہوگیا، اور تیز قدموں سے چلتا ہوا باہری کمرے کے دروازے پر پہنچا، ابھی میرے قدم اندر کی جانب داخل ہی ہورہے تھے، کہ مجھے ایک جھٹکا لگا ـــ میری نظروں کے سامنے ایک انسانی جسم سفید چادر میں لپٹا پڑا تھا ـــ وہاں پر موجود ایک آدمی نے مجھے دیکھ کر سفید چادر چہرے پر سے ہٹا دیا ـــ اُف، انکل ـــ یہ آپ ہیں ـــ یہ آپ اس طرح سو رہے ہیں، کبھی نہ جاگنے کے لئے۔ نہ جانے کتنے لوگوں کو جگایا آپ نے،

ابھی نہ جانے کتنے ایسے لوگ ہیں، جنھیں جگانے کی ذمہ داری آپ پر تھی، لیکن آپ تو سو گئے، ابدی نیند، پھر کون انھیں جگائے گا، کون انھیں بے لاگ اور برملا سنا کران کے اندر کی انسانیت کو جھنجھوڑے گا، کون حمام کے ننگوں کو عنابی کے کانچ کے ٹکڑے دکھا کر شرم دلائے گا۔

میں سسک پڑا اور کمرے کے دروازے کے قریب سے ہی لوٹ آیا، معاً میری نگاہیں اوپر سے نیچے اُترتی سیڑھیوں پر پڑ گئیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے بس، ابھی ابھی درمیانے قد کے، گوری رنگت، تابناک چہرہ، خوبصورت فریم کے چشمہ کے پیچھے سے جھانکتی چمکتی آنکھیں، دیدہ زیب لباس میں ملبوس انکل ایک باوقار انداز میں آئیں گے اور کہیں گے ــــ "آ گئے تم؟"

لیکن سیڑھیاں بھی خاموش اور اداس تھیں۔ میں دائیں بازو والے کمرے میں آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا ــــ اور میری آنکھوں سے ضبط کا باندھ ٹوٹ پڑا ــــ

میری نظروں کے سامنے انکل کی ڈوبتی اُبھرتی تصویریں اُبھرنے لگیں ــــ وہ ہال، جہاں میں ابھی ابھی انھیں دیکھ کر آرہا ہوں، وہ ہال کبھی نت نئی تحریکوں کی آماجگاہ تھا۔ وہاں فکروفن کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا ــــ اس ہال کی ایک ایک اینٹ، ایک ایک شئے اس بات کی گواہ ہے کہ کیسی کیسی بڑی شخصیتوں نے کیسی بڑی بڑی باتیں یہاں کی ہیں، کیسے کیسے نادر خیالات و افکار نے اس ہال میں جنم لیا ہے۔ کیسے کیسے لوگوں کے اندر کے فن کو باہر نکالا گیا ہے اور ان کے احساس کمتری کو دور کر کے خود اعتمادی بحال کی گئی ہے اور ان کی اہمیت کا لوہا منوایا گیا ہے ــــ لیکن "انکل" نے خود اپنے لئے کیا کیا؟ شاید کچھ نہیں ــــ وہ خود کہتے تھے ــــ "میں تو فقیر آدمی ہوں۔"

لیکن وہ ایسے فقیر تھے، جو دونوں ہاتھوں سے علم وادب کی دولت زندگی بھر لٹاتے رہے، اور خود کبھی کچھ پانے کی تمنا نہیں کی۔ لوگ کرسی پانے کی دوڑ میں بھاگتے پھرتے تھے اور وہ کرسی سے دور بھاگتے تھے کہ کرسی پا کر کہیں ان کا قیمتی سرمایہ، دنیاداری کے تلاطم میں کھو نہ جائے۔ اپنی "انا" کے لئے ہی تو وہ مشہور تھے ــــ اور اسے وہ کبھی کسی قیمت پر بھی مجروح نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ ان کے ہال میں ایسے لوگوں کو بھی ہاتھ باندھے کھڑے دیکھا گیا، جو ان کے ہاتھوں ٹیگور سے بڑا فنکار

اور بھگوان کا اوتار کا خطاب پا کر بڑا سے بڑا عہدہ دینے کو تیار رہتے تھے ـــــ لیکن انکل ایسی سخت
مٹی کے بنے تھے کہ ان کے اوپر ان عہدوں کے لئے کبھی کوئی چمک نظر نہیں آئی۔ وہ برملا اور بے لاگ
باتیں کرتے، ننگوں کو آئینہ دکھانے میں انھیں خاص لُطف آتا کہ میں نے یہ جرأت کی ۔ "انکل" کے
بعض دوستوں نے سمجھایا بھی کہ آپ اتنا "سچ" کیوں بولتے ہیں، کیوں لوگوں کی خفگی اور دشمنی مول لیتے
ہیں۔ جواب میں ان کا گورا چٹا چہرہ تمتماجاتا اور وہ گرج پڑتے ۔ "تو کیا میں بھی بکاؤ بن جاؤں؟"

لوگ خاموش ہو جاتے کہ ان کی باتوں میں وزن تھا ـــــ اور یہ وزن 'آج کے دور اور ماحول
میں بھی بڑھتا ہی رہا ـــــ ان کا قد بلند سے بلند تر ہوتا گیا ـــــ اتنا بلند کہ وہ سڑتے گلتے سماج کو،
تعقن سے بھرے ماحول کو، بدنام ہوتے سماجی رشتوں کو، ذات پات اور فرقہ پرستی کے بڑھتے ہوئے
حالات کو، کھوکھلی ذہنیت اور عیاریوں کو بڑے صاف طور پر دیکھتے تھے۔ لیکن ان حالات نے ......

اچانک میرے خیالوں کا تانا بانا ٹوٹ گیا، کمرے میں کئی لوگ داخل ہو کر میرے اِرد گرد کی کرسیوں
پر بیٹھ گئے تھے۔ میں خاموشی سے اُٹھ کھڑا ہوا ـــ اور کمرے سے باہر نکل آیا ـــ تعزیت میں آنے
والوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا ـــ باہر لان میں کافی تعداد میں کرسیاں ڈال دی گئی تھیں ـــ
لیکن زیادہ تر کرسیاں خالی ہی تھیں ـــ میں آنے والے چہروں میں وہ چہرے تلاش کر رہا تھا ـــ جو "انکل"
کی جی حضوری میں لگے رہتے تھے اور ان کی قدآور شخصیت کے سایہ میں اپنی شخصیت کو بنا کر اپنے
چہرے پر نت نئے مکھوٹے لگائے گھوم رہے تھے۔ بلکہ بعض لوگ تو ایسے بھی تھے جو اپنی جیبوں میں
طرح طرح کے مکھوٹے لئے گھومتے رہتے اور جب جیسا موقعہ دیکھتے وہ کوئی مکھوٹا اپنے چہرے
پر لگا لیتے ـــ

صبح سے دوپہر ہو گئی اور دوپہر سے شام ـــ میری نگاہوں کے سامنے جو چہرے صبح میں
تھے، وہی چہرے شام میں بھی رہے ـــ وہ مکھوٹے والے لوگ کہاں گئے ـــ شاید، وہ اب کہیں
اور تناور سایہ کی تلاش میں سرگرداں ہوں گے۔

ڈوبتی شام کے آخری لمحوں میں جب انکل کو سپردِ خاک کر کے قبرستان سے باہر نکلا تو ایک

صدا سنائی دی ـــــ

"کچھ دیتے جاؤ بابا لوگ "۔

میں نے پلٹ کر دیکھا ـــــ بوسیدہ اور تار تار کپڑوں میں لپٹا بوڑھا فقیر ہاتھ میں کشکول لئے کھڑا تھا ـــــ میں نے اپنی جیب سے چند سکّے نکال کر اس کے کشکول میں ڈال دئے اور کہا ۔

"لو بابا ـــ دونوں ہاتھوں سے لُٹانے والا فقیر تو چل بسا اور تو برسوں سے کشکول لئے کھڑا ہے "۔

گھر لوٹتے لوٹتے رات ہوگئی ـــــ اپنے کمرے میں آکر بستر پر ڈھیر ہوگیا ـ "نیوز" کا وقت ہوچکا تھا ـــ ایک تجسس کہ دیکھوں لوگ ایسے فقیر کے بارے میں کیا بولتے ہیں، کس طرح سے تعزیت پیش کرتے ہیں، میں نے ٹی ۔ وی سیٹ آن کر دیا ـــــ لیکن پوری نیوز ختم ہوگئی ـــــ اور اس شخص کی موت کا کہیں کوئی ذکر نہیں، جس نے نہ جانے کتنے صحرا کے بگولوں کو اپنی مٹھیوں میں قید کیا تھا۔ اور اپنے فکر و فن سے کتنے ستارے منوّر کئے تھے ۔

میں نے آگے بڑھ کر ٹی ۔ وی ۔ آف کر دیا ۔ اور سوچنے لگا۔ کاش انکل، اپنی انا کے خول سے باہر نکل آتے، تو آج ہر طرف ان کی موت پر آنسو بہائے جاتے، تعزیت نامے کے ڈھیر لگ جاتے۔ لیکن پھر سوچا ـــ جس دن وہ اپنی انا کے خول سے باہر نکل آتے ان کی موت تو اسی دن ہوجاتی اور اتنے عرصے تک وہ اپنے ہی مُردہ جسم کو اپنے کاندھوں پر ڈھوتے رہتے، جس طرح لوگ آج خود کو ڈھو رہے ہیں !!

ـــــــــ :: ـــــــــ

سائے کا تعاقب

کمرے کے اندر ہی بلب شیڈ کے اوپر بنے گھونسلے کی چڑیوں کی چہچہاہٹ نے بابا کی کھلی آنکھوں کے سپنے کو توڑ دیا۔ نیند تو کمبخت آتی ہی نہیں جو بند آنکھوں کا سپنا دیکھتے۔ کبھی چپکے سے تھوڑی دیر کے لئے نیند کی دیوی اپنی آغوش میں لیتی تو خوشگوار ماضی حال کو دیکھکر اداس ہو جاتا ہے اور پھر وہی اداسیاں ہی اداسیاں، تنہائیاں ہی تنہائیاں، ہر سمت ویرانیاں ہی ویرانیاں، خزاں ہی خزاں — کبھی کبھی بابا کو خود اپنی بینائی پر شک ہونے لگتا۔

"کیا میری آنکھیں......"

لیکن رامو چائے والے نے کہا تھا، اُس دن رامو چائے والا بھی شاید موڈ میں تھا —

"نہیں بابا! یہ مہینہ تو بہار کا ہے۔"

"لیکن رامو بیٹا، بہار کا مہینہ ہے تو پھر........ وہ سب کیا ہوئے، وہ ہریالی، وہ شادابیاں، وہ ہوا کے خوشگوار جھونکے، کیا وہ سب......"

لیکن رامو کی توجہ بابا کے سوال پر نہیں، بلکہ اس کا پورا دھیان اپنے گاہکوں پر تھا۔ رامو بھی شاید بابا کی پرانی باتوں کو سُن سُن کر تنگ آ گیا ہے کہ بابا تو بس ہر وقت بکتا ہی رہتا ہے، بابا کے ڈھیر سارے سوالوں کے جواب میں رامو کئی بار جھنجھلا کر کہہ چکا تھا — "بابا بس تم

ایک روپے کی ایک کپ چائے میں میرے دو روپے کا اخبار پڑھ کر چُپ رہا کرو، تبصرہ مت کیا کرو۔"

اور بابا چُپتی سادھ کر سوچنے لگے ۔۔۔ آج میری گفتگو لوگوں کو ناگوار گزرتی ہے لیکن کچھ عرصہ قبل تک میری باتیں سننے کے لئے لوگ آندھی اور طوفان میں بھی میرا انتظار کرتے تھے۔ اُف، یا خدا، یہ کیسا تضاد ہے، موت بھی تو کمبخت نہیں آتی، موت آجاتی تو شاید سکون مل جاتا، یہ تنہائیاں، یہ ویرانیاں، یہ بے بسی......، ان کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اب تو میں ایک کھوٹے سکّے کی مانند ہوں، جسے ہر شخص اِدھر سے اُدھر اُچھال دیتا ہے، کوئی بھی میری قدر نہیں کرتا۔

کھٹ..... کھٹ..... کھٹ.....

باہر دروازے پر ہونے والی دستک نے بابا کے خیالات کے تانے بانے کو توڑ دیا اور ان کی توجہ دستک کی جانب مرکوز ہوگئی۔

"اتنی صبح سویرے اور میرے یہاں، کون ہو سکتا ہے؟"

بابا خود ہی دھیرے سے بڑبڑائے ۔۔۔ "سب کے سب مجھ سے گھبراتے ہیں کہ کہیں میں آزادی کی لڑائی کے قصّے اور اپنی بیوی کے صبر و تحمل کی بات سنا کر ان کے قیمتی وقت کو ضائع نہ کر دوں۔ میں خود سوچتا ہوں کہ میں ماضی کے اوراق لوگوں کے سامنے نہ کھولوں، لیکن کیا کروں، میں مجبور ہوں، نہ جانے وہ کون سا انجانا جذبہ ہے جو ان اوراق کے قصّے سنانے پر مجبور کرتا ہے۔ اس میں میرا مفاد بس اتنا شامل ہوتا ہے کہ ماضی کی کہانی سنا کر میری آنکھوں کی چمک لوٹ آتی ہے، مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔ اس دن میں بے حد خوش رہتا ہوں۔ بس ایسا لگتا ہے جیسے میں نے ابھی ابھی خوشگوار ماضی میں سانسیں لی ہیں۔ ابھی ابھی اپنے بیٹے حمید کو سینے سے لگا کر پیار کیا ہے۔ اس کے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سمجھایا ہے۔۔۔

"بیٹے اپنے ملک کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینا بھی مذہب کا ایک اہم حصّہ ہے۔ ہماری آج کی قربانی کل کا شاندار مستقبل ہوگا۔" پھر اپنی بیوی کو اپنی باہوں میں بھر کر، اس کی آنکھوں سے بہتے

آنسو پونچھتا ہوں، اُسے سمجھاتا ہوں "صبر و تحمل کا ثبوت دو، یہ وقت تمہاری اور ہماری آزمائش کا ہے..."

کھٹ..... کھٹ..... کھٹ......

"اوہ، آرہا ہوں بھائی کون ہے ؟"

بابا کی اُداس اور نحیف آواز کمرے میں گونجی اور وہ آنکھوں پر چشمہ چڑھاتے ہوئے پلنگ کے قریب رکھی اپنی چھڑی اُٹھاکر دروازے کی جانب بڑھے۔

"کون ہو بھائی ۔؟"

"جی، میں ہوں بابا، دنیش ۔"

"اوہ، دنیش، آؤ بیٹا۔" بابا نے دروازہ کھول دیا۔

"کیوں، بابا، آپ تیار نہیں ہیں ؟" دنیش نے اندر داخل ہوتے ہی بابا سے سوال کیا۔

"تیار، کہاں چلنا ہے بیٹا ؟" بابا نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دنیش سے پوچھا۔

"اوہ بابا آپ بھول جاتے ہیں، آج ۱۵ اگست ہے، آپ نے مجھے بلایا تھا ساتھ گاندھی میدان چلنے کو۔ یوم آزادی کے فنکشن میں شرکت کے لئے ۔"

"ہاں، بیٹا، اُف میری یادداشت بھی جواب دئے جارہی ہے۔ تم بیٹھو، بس میں ابھی تیار ہو کر آتا ہوں ۔" کہتے ہوئے بابا کمرے سے ملحق دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ دنیش پلنگ کے قریب رکھی تین ٹانگ والی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کی نظریں ہمیشہ کی طرح پورے کمرے کی دیواروں پر ٹنگی مختلف تصاویر، سیاسی ناموں، اخباری کترنوں کے فریموں پر سے پھسلنے لگیں، یہ تمام تصویریں، سیاسی نامے اور اخباری کترنیں بابا سے متعلق تھیں۔ مختلف تصویروں میں بابا مختلف پوز میں تھے۔ کسی میں بڑی گرمجوشی سے تقریر فرمارہے تھے۔ کسی تصویر میں بابا کسی اہم میٹنگ کی صدارت کر رہے تھے یا مہمان خصوصی کی حیثیت سے تشریف فرما تھے، کسی تصویر میں بابا ملک کی مقتدر ہستیوں کے ساتھ فکر و خیال کی دنیا میں ڈوبے ہوئے تھے اور سیاسی و سماجی تقاریر کی اخباری کٹنگ بھی بتا رہی تھیں کہ بابا کو اس زمانے میں اخبار والے بھی کتنی اہمیت دیتے تھے، لیکن آج بابا ..... کیا یہ وہی بابا ہیں۔ ماضی اور حال کا

اتنا بڑا تضاد.....

لیکن دنیش کو زیادہ دیر بابا کے ماضی اور حال پر سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ اس لئے کہ بابا، اس کی نظروں کے سامنے اپنے شاندار روایتی لباس میں ملبوس تیار کھڑے تھے۔ چُست پاجامہ، شیروانی، سر پر گاندھی ٹوپی، ہاتھ میں چھڑی......

"چلو بیٹا دنیش، کہیں دیر نہ ہو جائے۔" یہ کہتے ہوئے بابا دنیش کو لئے ہوئے باہر آئے اور دروازے میں قفل لگا کر آگے بڑھتے چلے گئے۔ راستے میں دنیش نے رکشہ کر لینے کا اشارہ کیا۔ لیکن بابا کو اپنی جیب میں پڑے بس چند سکّوں کا علم تھا، اس لئے انھوں نے ٹال دیا۔

"نہیں بیٹے، پیدل ہی چلتے ہیں، صبح کا وقت ہے، ذرا ہوا خوری بھی ہو جائے گی۔"

وہ دونوں جب گاندھی میدان پہنچے تو اس وقت تک کافی لوگ آ چکے تھے۔ دنیش اور بابا ایک گیٹ میں داخل ہو گئے۔ ابھی چند ہی قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ ایک سپاہی نے روکا — "اے ادھر کا پاس ہے؟"

"نہیں، پاس تو نہیں مگر...." بابا نے بڑی بے چارگی سے جواب دیا۔

"اگر مگر کچھ نہیں، پاس نہیں ہے تو اُدھر جاؤ....." اور سپاہی نے بڑی بے رحمی سے بابا کو ایک جانب دھکا دے دیا۔ بابا لڑکھڑا گئے۔ دنیش نے جلدی سے ان کی باہیں پکڑ لیں، ورنہ بابا چاروں خانے چت گر جاتے، اِس گیٹ سے واپس نکل کر دوسرے گیٹ میں داخل ہوئے، کچھ فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک زوردار سیٹی بجی — "اے بڈّھا، اِدھر کہاں؟ اِدھر صرف کار والے لوگ جاتے ہیں، صرف وی۔ آئی۔ پی سمجھے، چلو، ہٹو، اُدھر جاؤ، پولیس آفیسر نے ایک جانب اشارہ کیا اور قریب سے گزرتی ہوئی سفید چمچماتی کار کو سیلوٹ کرنے لگا۔

بابا دنیش کو لئے ہوئے تیسرے گیٹ میں داخل ہوا — یہاں بابا کو کسی نے نہیں روکا، یہاں بس لوگوں کا اژدہام تھا جن کے درمیان بابا گم ہو گئے۔ بابا آگے بڑھتے چلے گئے۔ لیکن پچھلے حصے میں بیٹھے لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا — "بیٹھ جاؤ .... بیٹھ جاؤ....اے بڈھے میاں

بیٹھ جاؤ....''

اور بابا نے بڑی بے چارگی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھا، شاید کوئی انھیں پہچاننے والا مل جائے۔ لیکن انھیں کوئی پہچاننے والا نہیں ملا۔ بیٹھ جاؤ..... بیٹھ جاؤ بڈھے کا شور بڑھتا ہی گیا۔ مجبوراً بابا کو کھردری زمین پر ہی پالتی مار کر بیٹھ جانا پڑا۔

قومی ترانے، جھانکی اور تقریر کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ بابا کی نگاہیں سامنے ٹکی ہوئی تھیں لیکن ذہن ماضی کی ان خوشگوار یادوں میں گم تھا، جب کبھی وہ خود لوگوں کی نگاہوں کے مرکز بنے رہتے تھے، لیکن آج، وہ بھیڑ میں اس طرح گم ہیں کہ کوئی انھیں پہچاننے والا بھی نہیں ہے۔ بابا کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا اور بوند بوند زمین میں جذب ہونے لگا۔

——٭——

ایک سچویشن

بچّے نے آخر جنم لے ہی لیا۔ نرس نے بچّے کو اٹھا کر اس کی ماں کی آغوش میں ڈال دیا۔ ماں کی آنکھیں دھیرے دھیرے کھُلیں اور اپنے قریب بچّہ دیکھ کر ایک منٹ کے لئے ٹھٹکی اور پھر اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی وہ تقریباً چیخ پڑی، نہیں ...... نہیں ...... کُتّے، کمینے کی اولاد، تجھے بھی اسی کی شکل میں پیدا ہونا تھا؟ یہ کہتی ہوئی وہ اپنا ہاتھ بڑی تیزی سے بچّے کی گردن کی جانب بڑھانے لگی۔ نرس جو قریب ہی کھڑی تھی، پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، لیکن بات جب اس کی سمجھ میں آئی تو اس نے پلک جھپکتے ہی بچّے کو لپک لیا۔

"یہ کیا کر رہی ہو، بچّے کو جان سے مارنے کا ارادہ ہے کیا؟"

"ہاں، ہاں میں اسے جان سے مار رہی ہوں، اس کی سزا میں اسے ہی دوں گی۔"

"لیکن اس بچے کا قصور کیا ہے؟ اسے دنیا میں آئے ابھی گھنٹہ بھر بھی نہیں ہوا؟"

"اس کا قصور پوچھتی ہو، اس کا قصور پوچھنا ہے تو جاؤ میرے محلّے میں، سارے لوگ اس کا قصور جانتے ہیں۔ اس کا باپ رامو جو مشہور غنڈہ ہے۔ کتّے جیسی مکروہ شکل ہے اس کی۔ سبھی اس سے نفرت کرتے ہیں اور خوف زدہ رہتے ہیں۔ اس کے چہرے پر بدنما داغ ہیں، خوفناک اور لال لال انگارے جیسی دہکتی آنکھیں۔ بڑی بڑی مونچھیں، شراب کے نشے میں ہر وقت دُھت،

چوری، ڈکیتی، قتل و خون اور معصوم و بھولی بھالی لڑکیوں کی عصمت دری اس کا شوق ہے۔ دیکھنے میں آدمی ہے، لیکن درحقیقت وہ بھیڑیا ہے بھیڑیا۔ میری جیسی کتنی لاچار اور مجبور لڑکیاں اس کمینے کی ہوس کی شکار ہو چکی ہیں۔ کتنی لڑکیوں نے خودکشی کرلی ہے، میں بھی ...... ہاں میں بھی خودکشی کررہی تھی، لیکن میرے بوڑھے اندھے باپ ـــــ جس کی آنکھیں بھی میں ہوں، پاؤں بھی میں ہوں۔ اس نے بچپن میں میری ماں کی موت کے بعد کتنے لاڈ، پیار سے مجھے پوسا، پالا۔ لیکن میں بدنصیب ـــــ اسے کوئی سکھ نہ دے سکی۔ دُکھ، درد اور گھٹن کے سوا میں نے اسے دیا ہی کیا ہے۔ لیکن اس میں میرا قصور بھی کیا ہے۔ میری غربت اور مفلسی نے مجھے آج اس ناجائز اولاد کی ماں بنا دیا....."

یہ کہتے کہتے وہ بے اختیار سسک پڑی، اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا......

اپنے روم میں بیٹھی ڈاکٹر نے جب رونے کی آواز سنی تو دوڑتی ہوئی آئی، اور سروج کے بیڈ کے قریب کھڑی نرس اور اس کی گود میں بچہ دیکھا، سروج کی ہچکیاں ابھی تک رُکی نہیں تھیں۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ تو اس نے نرس کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ نرس بُت بنی کھڑی رہی۔ ڈاکٹر آگے بڑھی اور روتی ہوئی سروج کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا ـــــ "کیا بات ہے سروج، تم کیوں رو رہی ہو؟"

سروج نے اپنے کاندھے پر محبت بھرا ہاتھ محسوس کیا تو اس نے چہرے پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔ دیکھا سامنے ڈاکٹر کھڑی ہے۔

"ڈاکٹر، مجھے یہ بچہ نہیں چاہئے، یہ بچہ میری رسوائیوں، بدنامیوں اور مجبوریوں کی نشانی ہے۔ مہربانی کرکے اسے یہاں سے ہٹا دیجئے۔ میری نظروں کے سامنے سے اسے دور کردیجئے۔ مجھے اس سے نفرت ہے، شدید نفرت، میں اس کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی۔"

"لیکن کیوں، آخر ایسی کون سی وجہ ہے؟"

"ڈاکٹر، یہ لڑکا میری ناجائز اولاد ہے۔ میرے محلے کا مشہور غنڈہ رامو دادا کی یہ اولاد ہے۔ جس کی ہوس کی میں ایک دن شکار ہوئی۔ میں اس کے سامنے روتی رہی۔ اسے بھگوان کا واسطہ دیتی رہی۔ اپنی عزت اور عصمت کی میں رو رو کر گڑگڑا کر بھیک مانگتی رہی، لیکن وہ انسان کہاں ہے، جو رحم کرتا، وہ تو درندہ ہے درندہ ـــــ اور میں ایک غریب لڑکی اپنی بے حرمتی کے بوجھ کو پورے نو ماہ تک ڈھوتی رہی ـــــ یہ لڑکا ہر لمحہ، ہر پل مجھے اس خونخوار بھیڑیئے کی یاد اور اپنی مجبوری، بے بسی اور بے عزتی کا احساس دلاتا رہے گا۔ میں ابھی جینا چاہتی ہوں۔ اپنے اندھے اور لاچار بابا کے لئے۔ اس لئے ڈاکٹر زندگی بھر میں آپ کی احسان مند رہونگی۔ اس بچے کو کسی ندی یا گٹر میں پھینکوا دو، مجھے سکون مل جائے گا۔ میں سمجھوں گی میں نے رامو دادا سے بدلہ لے لیا۔ میں کسی قیمت پر بھی اپنے اوپر لگے کلنک کے اس بوجھ کو نہیں رکھ سکتی۔ ڈاکٹر..... ڈاکٹر...."

سروج کی التجا میں بڑا درد چھپا تھا۔ ڈاکٹر چند لمحوں تک خاموشی سے کچھ سوچتی رہی اور پھر سروج سے مخاطب ہوئی۔

"لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میرا پیشہ زندگی دینا ہے زندگی لینا نہیں۔"

"ڈاکٹر تم بھی ایک عورت ہو، ایک غریب اور مجبور لڑکی کی پریشانیوں کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہو۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں اس بچے کو ساتھ رکھ کر ہمیشہ اس غنڈے کی دی ہوئی منحوس نشانی کو اپنا خون پلاؤں، سارے زمانے کے سامنے اپنی بے عزتی اور بے حرمتی کے وجود کو لئے پھروں۔ اس لئے ڈاکٹر مجھ پر احسان کر دو۔ مجھے اس بچے سے نجات دلا دو۔"

ڈاکٹر، ایک بار پھر سوچ میں ڈوب گئی۔

"اچھا ٹھیک ہے، میں اسے مار تو نہیں سکتی، ہاں کسی اناتھ آشرم میں بھجوائے دیتی ہوں۔" یہ کہتی ہوئی وہ باہر نکل گئی اور پھر پندرہ منٹ بعد جب وہ واپس آئی تو اس کے ساتھ ایک مرد تھا ـــــ

ڈاکٹر نے آتے ہی نرس سے کہا۔ "سسٹر تم اس بچّے کو اس آدمی کے حوالے کر دو۔ یہ اسے اناتھ آشرم پہنچا دے گا۔"

سروج خاموشی سے نرس، ڈاکٹر، بچے اور اس مرد کو دیکھتی رہی۔

آنے والے مرد نے نرس کی گود سے بچہ لے لیا، لیکن مرد کی گود میں جاتے ہی بچہ بلک بلک کر رونے لگا۔ مرد بچّے کے رونے کو نظر انداز کرتا ہوا باہر جانے والے دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ بچّے کے رونے کی آواز کمزور ہوتی گئی۔ ایک عجیب درد بھرا منظر تھا۔

اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ سروج اپنے بستر پر سے زمین پر کود ی۔ نہیں، نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر میں اس بچّے کو الگ نہیں کر سکتی۔ میں سہہ لوں گی ساری رسوائیوں بدنامیوں کو جھیل لوں گی۔ وہ تقریباً دوڑتی ہوئی مرد کے قریب پہنچ گئی اور اس کی گود سے بچہ جھپٹ لیا۔ اور اسے چومتی ہوئی اپنے بستر پر آ گئی اور اس کے منھ کو اس نے ماما کے بہتے ہوئے سوتے سے لگا دیا۔

بچّہ اب بالکل خاموش تھا اور سروج کے چہرے پر سکون اور اطمینان کی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں۔
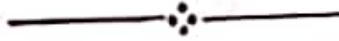
آگ سے روشنی

سارا پلان تیار ہو گیا تھا۔ کافی دور سے آکر نیتاجی نے اپنی اشتعال انگیز تقریر سے ماحول کو ایسا بنا دیا کہ ہم لوگوں کو شاندار کامیابی کا یقین ہو گیا تھا۔ انہوں نے ہی بیس بیس نوجوانوں کی ٹولی بنا دی تھی جو برسوں سے بے روزگاری اور غربت سے تنگ آچکے تھے اور پناہ ڈھونڈ رہے تھے۔ انھیں تھوڑی بہت ٹریننگ بھی دے دی گئی اور اب وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کو بے چین تھے۔

میری کئی سال کی شاندار کارگزاریوں کو دیکھتے ہوئے مجھے ایک گروپ کا لیڈر بنا دیا گیا اور ایک خاص علاقے کی پوری ذمہ داری مجھے سونپ دی گئی۔

گروپ لیڈر بن کر میں بھی بہت خوش تھا۔ اور بڑی بے صبری سے اس وقت اس لمحے کا انتظار کرنے لگا جب مجھے اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے پورے علاقہ کو راکھ کا ڈھیر بنا دینا تھا۔

اور ——— اور پھر وہ وقت آ ہی گیا۔ طرح طرح کی افواہوں نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا اور شام ہوتے ہی پورے علاقے میں دہشت اور سراسیمگی پھیل گئی۔ ہر شخص پریشان اور سراسیمہ تھا۔ ماحول اس قدر کشیدہ ہو چکا تھا کہ رات کی تاریکی پھیلنے سے قبل ہی پورے علاقے کی دوکانیں بند ہو گئیں، گھروں سے دروازے اور کھڑکیاں تک بند ہو گئیں، ہر طرف تاریکی ہی تاریکی، بھیانک اور

خوفناک سناٹا۔ کتوں کے بھونکنے کی بازگشت ماحول کو مزید ہیبت ناک بنائے دے رہی تھی۔
اور میں ادھر اپنے منصوبے کو آخری شکل دینے میں مصروف تھا۔
چند گھنٹوں بعد دور سیاہ رات کے خوفناک سناٹے میں ڈوبے گھڑیال نے بارہ بجائے
اور ہم لوگ نکل پڑے۔ ہمارے ہاتھوں میں بم، بندوقیں، خنجر، ننگی تلواریں، پٹرول کے ٹن اور
مشعلیں تھیں۔ ہم بڑے جوش اور دلولہ کے ساتھ فلک شگاف نعرے بلند کرتے ہوئے آگے بڑھنے
لگے۔ دو چوراہے سے گزرنے کے بعد ہی ہمیں مخالف سمت سے نعرے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔
ہم کچھ ہی دور آگے بڑھے تھے کہ ہم پر اینٹوں اور پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ گولیوں اور بموں کے
دھماکے گونجنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے گاندھی چوک میدانِ جنگ میں تبدیل ہو گیا۔ پروگرام کے مطابق
ہمارے پندرہ آدمی مخالف سمت سے آنے والے لوگوں سے بھڑ گئے اور بقیہ پانچ آدمی آس پاس
کی دوکانوں اور مکانوں میں پٹرول چھڑک کر آگ لگانے میں مصروف ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں
دوکانیں اور مکانات دھو دھو کر جلنے لگے، جلتے مکانات سے شور مچاتے بچے اور عورتیں بھاگنے لگیں۔
اور ان بھاگتی عورتوں اور بچوں کو ہمارے ساتھیوں کی گولیوں اور تلواروں نے ڈھیر کرنا شروع کر دیا۔
بچاؤ، بھاگو کی چیخ پکار، دھماکے، آگ، شور اور نعرے نے ایک ایسا خوفناک اور بھیانک
سماں بنا دیا کہ ایک لمحے کے لئے میں بھی سہم گیا اور جس وقت میں نے بھاگتی ہوئی ایک عورت
اور اس کے سینے سے چپکے بچے پر تلوار سے حملہ کیا، ان دونوں کے منہ سے ایسی دلدوز چیخ ابھری
کہ میں کانپ گیا اور اچانک میری نظروں میں میری بیوی اور چھوٹے بیٹے بلو کی تصویر سامنے ابھر گئی۔
میں چند لمحوں کے لئے رُک گیا پھر مجھے دی گئی ٹریننگ یاد آئی کہ ایسے لمحوں میں دل سے نہیں
دماغ اور طاقت سے کام لیا جاتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میری خود اعتمادی لوٹ آئی اور
پھر میں اُسی جوش و خروش کے ساتھ اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑنے لگا۔ مرد، عورت، بچے
کراہ کراہ کر ایک دوسرے پر ڈھیر ہونے لگے، مکانات جلنے لگے۔ ہر طرف انسانی لاشوں کا ڈھیر
کراہ، چیخ، شور اور یہ سب کے سب جیسے میری حیوانیت بڑھا رہے تھے۔

چند گھنٹوں کے اندر ہی پروگرام کے مطابق پورا علاقہ خاک و خون میں ڈوب گیا تو میں نے ایک مخصوص سیٹی بجائی، جسے سن کر میرے ساتھی میرے گرد جمع ہو گئے۔ ہر طرف اُٹھتی آگ اور دہکتے شعلوں میں، میں نے اپنے دوستوں کے چہروں پر نظریں ڈالیں۔ اُف اتنے بھیانک اتنے خوفناک چہرے، اُن کی آنکھوں سے خون ٹپک رہے تھے، ان کے ہاتھ انسانی خون سے رنگے ہوئے تھے ان کے کپڑوں پر بھی خون ہی خون تھے اور یہی حال میرا بھی تھا۔

ہم نے اپنی کامیابی پر ایک فلک شگاف قہقہہ بلند کیا اور پھر نعرہ لگاتے ہوئے فاتحانہ انداز میں واپسی کے لئے مڑ گئے۔

اچانک میرے ایک ساتھی نے قریب آکر کہا ـــ اس موقع سے کچھ اور فائدہ کیوں نہ اُٹھایا جائے۔

"کیا مطلب؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

میرے ساتھی نے ان مکانوں کی جانب اشارہ کیا، جن کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور لوگ اپنی جان بچانے کے لئے کہیں بھاگ گئے تھے یا پھر ہماری گولیوں اور تلواروں کا لقمہ بن گئے تھے۔

میں اپنے ساتھی کا مطلب سمجھ کر ایک مکان کی جانب دوڑ پڑا۔ میرے دوسرے ساتھی بھی دوسرے مکانوں میں داخل ہو گئے۔ اور تھوڑی دیر بعد جب ہم واپس ہو رہے تھے تو سبھی کے ہاتھوں اور کاندھوں پر قیمتی سامان تھے۔

اب یہاں زیادہ دیر رکنا ٹھیک نہیں۔ اس لئے کہ پولیس کی گاڑیوں کے سائرن کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ ہم لوگ ایک مخصوص راستے سے واپس ہونے لگے، میں سوچ رہا تھا یہ قیمتی سونے چاندی کے زیورات پاکر میری بیوی کتنا خوش ہوگی۔ یہ رنگین ٹی۔ وی اور وی۔ سی۔ آر وغیرہ پاکر میرے بچے تو خوشی سے کھل جائیں گے۔ اور یہ قیمتی ساڑیاں اپنی بہن کی شادی میں دے دوں گا اور یہ روپئے کے ڈھیر اپنی ماں کی گود میں ڈال دوں گا، وہ بھی کتنا خوش ہوگی، اس کی برسوں کی تمنّا

پوری ہوگی۔ اچانک میرے بڑھتے قدم رُک گئے۔ میری آنکھیں گاندھی چوک کے قریب کھڑے اہنسا کے پجاری مہاتما گاندھی کے مجسمہ کی بجھی آنکھوں سے ٹکرا گئیں اور میں ان بجھی آنکھوں کا سامنا نہیں کرسکا۔ میری نظریں جُھک گئیں اور میں بہت تیزی سے آگے بڑھ گیا اور لرزتے کراہتے، سسکتے زخموں سے چُور انسانوں اور ان کی لاشوں کو روندتا ہوا بڑی تیزی سے اپنے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا اور جلد از جلد گھر پہنچ کر اپنی بیوی، بچّوں، بہن، ماں کی گود میں خوشیاں بھر دینا چاہتا تھا۔ میرے قدم بڑی تیزی سے اُٹھ رہے تھے۔ ایک موڑ سے ہم لوگ اپنی گلی میں قدم رکھ چکے تھے، میری نظریں اپنے مکان کی طرف اُٹھیں ــــ لیکن یہ کیا ــــ وہاں سے شعلے اُٹھ رہے تھے۔ میں بے تحاشا دوڑنے لگا اور جب میں اپنے مکان کے بالکل قریب پہنچا اور جو منظر دیکھا، اُسے دیکھ کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ــــ میری بیوی، میرے ببلو کو سینے سے لگائے خون میں ڈوبی ابدی نیند سو رہی تھی، میرے دوسرے بچے کا سر دھڑ سے جُدا تھا۔ میری بہن کی لاش برہنہ پڑی تھی اور میری ماں کی لاش بتا رہی تھی کہ اسے کافی اذیت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس دلدوز منظر کو دیکھ کر بے اختیار میرے منھ سے بھیانک چیخ نکل گئی اور میں وہیں پر گر پڑا۔

اولڈ پیپلس ہوم

ھوائی جہاز جیسے ہی رن وے پر اُترا، تفضل حسین نے اپنے اندر سرور کی ایک لہر دوڑتی محسوس کی۔ پورے دس سال بعد آج اپنے ملک کی سرزمین پر وہ قدم رکھنے والے ہیں، جس سے وہ ناطہ توڑ کر چلے گئے تھے۔

تفضل حسین ہوائی جہاز سے باہر آئے۔ اپنے ملک کی مٹی سے اٹھنے والی خوشگوار ہوا کے جھونکوں نے ان کا استقبال کیا۔ کسٹم کے جھمیلوں سے چھٹکارا پاکر وہ جیسے ہی باہر نکلے، سامنے کئی جانے انجانے چہرے نظر آئے۔ ایک چہرے کی تلاشی نگاہوں نے انہیں پہچان لیا، بڑھ کر لپٹ گئے۔ "ابو"

"اوہ شمشاد، میرے پیارے بیٹے۔"

باپ بیٹے کی آنکھوں میں محبت کے آنسو تیرنے لگے اور وہ بے حد جذباتی ہو گئے۔ تفضل حسین کافی دیر تک اپنے بیٹے کو اپنے سینے سے لگائے رہے۔ ان دس برسوں میں دونوں کے گلے شکوے دور ہو چکے تھے۔ وقت اور دوری نے باپ بیٹے کے دلوں کے درمیان کی کھائی کو پاٹ دیا تھا۔

ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر اپنے چھوٹے بیٹے شمشاد کی بغل میں بیٹھ کر تفضل حسین سگریٹ

کے کش پر کش لیتے ہوئے پرانی یادوں میں کھو گئے۔

شمشاد، تفضل حسین کی نگاہ میں نالائق اور غیر ذمہ دار بیٹا تھا۔ جس نے کبھی بھی اپنے باپ کی قربانیوں کی پرواہ نہیں کی، ان کی محبت اور پیار کو اہمیت نہیں دی۔

بڑے بیٹے سرور کو ایم۔بی۔بی۔ایس کے بعد انگلینڈ میں فیلوشپ مل گئی تھی۔ وہ انگلینڈ گیا تو وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ کبھی کبھار بس خط سے یاد کر لیتا۔ اس کی شادی کی اطلاع بھی بس شادی کارڈ کے ذریعہ ہی ملی اور سرور کی یہ تمام باتیں تفضل حسین کی نگاہ میں اس کی مصروفیت کے باعث ہوئیں۔ ورنہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ سرور کو وقت ملتا اور وہ اپنے باپ سے ملنے نہ آتا۔ شادی کرتا اور مشورہ نہ کرتا۔ ادھر شمشاد کی دن بہ دن کی نازیبا حرکتوں سے وہ ذہنی اور جسمانی اذیتوں کے شکار ہو گئے تھے۔ انھیں غم تھا تو بس اس بات کا کہ جن بیٹوں کی پرورش کے لئے انھوں نے سارے سکھ اور آرام کو تج دیا، وہ آج سکھ اور آرام ہوتے ہوئے بھی ان کے دکھ کو نہیں سمجھ رہے ہیں۔ شمشاد اور سرور پانچ اور سات سال کے تھے کہ ان کی ماں دونوں بیٹوں کی پرورش کی ذمہ داری ان کے سپرد کر کے لمبے سفر پر روانہ ہو گئیں اور تفضل حسین پوری ایمانداری کے ساتھ اپنی ذمہ داری پوری کرنے میں لگ گئے۔ جوانی کے دن تھے، اس لئے کئی ہمدردوں نے دوسری شادی کا مشورہ بھی دیا، لیکن اپنے بیٹوں کے بہتر مستقبل کے لئے اپنی جوانی بھرے بہار کے دن کو قربان کر دیا، وہ جانتے تھے کہ دوسری بیوی کا سلوک ان کے بچوں کے ساتھ کیسا ہو گا۔

کئی گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد تفضل حسین کی ٹیکسی رُکی تو ان کے سامنے ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ مکان کے برآمدے میں کئی چھوٹے بڑے بچے کھڑے تھے۔ شمشاد کے ٹیکسی سے باہر نکلتے ہی بچوں کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دادا ابا آ گئے۔ "دادا ابا آ گئے" "دادا ابا آ گئے" کا شور مچاتے ہوئے بچے ٹیکسی کے گیٹ پر آ کھڑے ہوئے ـــــ تفضل حسین بھی انداز سے سمجھ گئے کہ یہ بچے شمشاد کے ہیں۔ ٹیکسی سے اتر کر سبھوں کو پیار کیا۔ بہو نے بھی دروازے پر آکر سلام کرتے ہوئے استقبال کیا۔ اندر کمرے میں پہنچ کر تفضل حسین کو ہر چیز بڑی عجیب سی لگی۔

لندن سے آنے کے بعد، ایک قصبے کا مکان — اپنا مکان ہوتا تو اس کی ادھڑی ہوئی درو دیوار سے انسیت اور محبت ہوتی، لیکن خواہش نہیں رہتے ہوئے بھی شمشاد کی خوشی کے لئے بھیگی آنکھوں کے ساتھ مکان فروخت کردیا تھا جن کے لئے سارے سکھ چین تج دیا اس کے لئے مکان کی کیا اہمیت۔

تفضل حسین کو اپنے ملک آئے کئی ماہ ہوگئے۔ آہستہ آہستہ انھوں نے خود کو ایک بار پھر یہاں کے ماحول اور فضا میں Adjust کرلیا Adjust ہونے میں کوئی پریشانی بھی نہیں ہوئی کہ جڑیں تو ان کی یہیں تھیں۔ اور پھر دس سال کا عرصہ طویل ہونے کے باوجود اتنا بھی طویل نہیں تھا کہ اپنے ماضی کو فراموش کردیتے۔ لندن میں قیام کے دوران اکثر انھیں اپنا گھر، اپنے دوست احباب کی یاد آتی اور یہ یادیں کئی بار آنسو بن کر ان کی آنکھوں میں لرزنے لگتیں۔ غم اور آنسو تو ان کا مقدر بن گئے تھے۔

اپنی جڑوں کو روندتے ہوئے وہ لندن گئے تھے، سرور کے پاس خوشیاں سمیٹنے۔ لیکن کاتب تقدیر نے تو ان کی قسمت میں کچھ اور ہی لکھ دیا تھا۔

دراصل ڈاکٹر سرور سے تفضل حسین کو کچھ زیادہ ہی امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ سرور کے دل میں اپنے باپ کے لئے بے پناہ جگہ ہوگی۔ اسے ضرور یاد ہوگا کہ اس کے باپ نے اس کے لئے کتنی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ کتنی ہی راتیں آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹی ہیں۔ اپنی ہر خواہش اور چاہت کو صلیب پر چڑھا کر اپنے بیٹوں کے لئے خوشیاں چاہی ہیں۔ ان کے بہتر مستقبل کے لئے ہر جتن کیا۔ اور شاید یہی احساس تھا کہ مکان فروخت ہوجانے کے بعد جب ان کے پاس کچھ نہیں بچا اور شمشاد اور اس کی بیگم کے رویہ میں تبدیلی اور سرد مہری آنے لگی تو ان کی زندگی اذیت ناک ہوگئی۔ بات بات پر طنزیہ جملے اور جلی کٹی سن کر وہ رو پڑتے۔ برداشت سے جب باہر ہوگیا تو وہ سرور کو خط میں ساری باتیں لکھنے پر مجبور ہوگئے۔ کئی خط کے جواب میں جس دن تفضل حسین کو لندن کا ٹکٹ اور ویزا ملا، اس دن تفضل حسین کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور جس وقت ان کے جہاز نے ٹیک آف کیا تفضل حسین

کو ایسا لگا جیسے ان کے سارے دُکھ درد دور بہت دور رہ گئے۔ اب آرام ہی آرام، زندگی کے باقی بچے دن سُکھ چین سے گزاریں گے۔

لندن پہنچ کر تفضل حسین کو یہاں کی ہر چیز نئی اور اجنبی سی لگی۔ لیکن سرور اور اس کے بال بچوں کے درمیان وہ سب کچھ بھول گئے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہاں بھی وہی سب کچھ شروع ہو گیا جس سے نجات حاصل کرنے وہ یہاں آئے تھے۔

سرور دن بھر ہاسپٹل میں رہتا اور اس کی بیگم کو ہر وقت اس کا گھر میں پڑے رہنا ناگوار گزرنے لگا۔ وہ خود کو کبھی فری محسوس نہیں کرتی۔ ناگواری جھنجھلاہٹ میں بدلی اور جھنجھلاہٹ نے نفرت کی صورت اختیار کر لی۔ سرور کے غائبانہ میں وہ اکثر جلی کٹی سنانے سے بھی باز نہیں آتی۔

"سرور نے کہاں سے میرے لئے یہ مصیبت بلا لی ہے۔ اُف کوئی بھی وقت ایسا نہیں جب میں آزادی سے کچھ کر سکوں۔"

حالانکہ تفضل حسین اسی وقت اپنی بہو سے کچھ کہتے، جب وہ بہت ضروری سمجھتے، اخبار، رسائل اور ناول وغیرہ ہی وقت گزارنے کا ذریعہ تھے۔ ہاں شام سرور اور بچوں کے ساتھ .... ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر خوش گپیاں اور ٹیلی ویژن دیکھنے میں گزرتی۔ لیکن جب سے انھوں نے محسوس کیا کہ سرور کی بیگم کے ساتھ ساتھ سرور کو بھی اس کا ڈرائنگ روم میں زیادہ دیر تک بیٹھنا ناگوار گزرتا ہے تو وہاں بھی جانا بند کر دیا اور خود کو کمرے میں مقیّد کر لیا۔ بس وقت پر سرور کی بیگم کھانا، ناشتہ پٹک جاتی۔ وہ اُٹھتے اور بڑی بے دلی سے کھانا کھاتے اور پھر وہی بستر۔

ایک دن تفضل حسین نے اپنی بہو کو سرور سے کہتے سنا کہ بچے اب بڑے ہو رہے ہیں۔ انھیں الگ ایک کمرے کی ضرورت ہے کچھ انتظام کیجئے۔

جواب میں سرور نے کہا کہ "بچوں کو ابّو کے کمرے میں Adjust کر دو، کیا پریشانی ہے۔"

"آپ ڈاکٹر ہو کر بھی ایسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ کے ابّو ہر وقت کھانستے رہتے ہیں، بچوں کی صحت اثر انداز ہوگی۔" بہو کہہ رہی تھی۔

"تو کیا کیا جائے، تم ہی کوئی حل نکالو؟" سرور کی آواز تھی۔

"آپ کیوں نہیں اپنے ابّو کو Old peoples Home بھیج دیتے ہیں، وہاں ان کا دل بھی لگے گا۔

بہو کی یہ بات سن کر ایک جھٹکا سا لگا تفضل حسین کو۔ آنکھیں بھر آئیں اور وہ سسکنے لگے۔ رات گئے تک وہ سسکتے رہے اور ان کی سسکی ڈرائنگ روم میں ٹیلی ویژن کے پاپ میوزک کی تیز آواز میں دَم توڑتی رہی۔

صبح سویرے خلاف معمول سرور کمرے میں آئے اور تفضل حسین سے مخاطب ہوئے۔

" ابّو ایسا ہے کہ آپ تنہا کمرے میں پڑے رہتے ہیں اس سے آپ کی صحت پر اثر پڑ رہا ہے اس لئے ہم نے سوچا ہے کہ آپ کو Old peoples Home پہنچا دیا جائے وہاں آپ کے کئی ہم عمر مل جائیں گے، آپ کا دل بھی لگے گا۔"

تفضل حسین رات سے ہی تیار بیٹھے تھے۔ کچھ بولنا چاہا لیکن جذبات نے زبان گنگ کر دی۔ بڑی مشکل سے اتنا ہی کہہ سکے۔ "تم نے جو سوچا ہے، وہ ٹھیک ہی ہے مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

اور اس طرح تفضل حسین Old Peoples Home پہنچا دئے گئے، پہنچا دئے گئے کیا بھیکوا دئے گئے۔ شروع کے چند ماہ میں سرور دیکھنے اور ملنے آتے رہے۔ آہستہ آہستہ آنے کا وقفہ بڑھتا گیا اور پھر ایسا ہوا کہ عید کے موقع پر "Wish you a Happy Eid" کہنے چلے آتے اور پھر انتظار کا طویل سلسلہ۔

دس برس لندن میں گزر گئے اور اس گزرے ہوئے وقت کی گرد نے شمشاد اور اس کی بیوی کی بدسلوکیوں کو دھندلا دیا تھا۔ اور پھر یہاں کی اذیت بھری زندگی۔ زندگی کا ایک ایک لمحہ خواب لگ رہا تھا۔ تنہائی میں اپنا ملک، اپنے لوگ، بیتی یادیں انھیں تڑپانے لگیں اور آخر انھوں نے کچھ انتظام کر کے اس بے وفا ملک کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

جن جڑوں کو روندتے ہوئے تفضل حسین لندن روانہ ہو گئے تھے انھیں جڑوں کو ایک بار پھر سینچنے کی کوشش شروع کردی ۔

لندن سے واپس آنے کے بعد ایک دو سال تو پلک جھپکتے گزر گئے ۔ لوگوں سے ملنے ملانے کا سلسلہ رہا ۔ لندن کی خوبیاں اور خامیاں، اپنے ملک سے موازنہ ، اپنے لوگوں کی یادوں کا ذکر ۔ لوگ بھی ان کی باتیں بہت غور سے سنتے کہ ان کے درمیان لندن کا ذکر کرنے والا کہاں کوئی تھا ۔ شمشاد اور ان کی بیگم و بچے بھی ان کا کافی خیال رکھتے ۔ لندن ریٹرن جو ٹھہرے ۔

لیکن آہستہ آہستہ جب یہ شک پوری طرح یقین میں بدل گیا کہ میاں تفضل حسین لندن سے خالی ہاتھ ہی لوٹے ہیں تو ان کے رویّہ میں پھر تبدیلی رونما ہونے لگی ۔ اور جس دن ان لوگوں کو مکمل یقین ہو گیا کہ تفضل حسین جس طرح گئے تھے اسی طرح واپس آئے ہیں اسی دن سے ان لوگوں نے اپنا رویہ بالکل بدل دیا ۔

تفضل حسین کو اس بدلے ہوئے رویّے کی وجہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی ۔ ان کا دل، دماغ، ذہن سوچتے سوچتے مفلوج ہونے لگا ۔ کیا سوچا تھا اور یہ کیا ہو رہا ہے ۔ کیا اسی دن کے واسطے اپنی ساری خوشیاں ان دونوں بیٹوں کے شاندار مستقبل کے لئے قربان کر دیں ۔ اب وہ کہاں جائیں ؟ کیا کریں ؟ کچھ بھی تو نہیں بچایا ۔ اپنی زندگی کے بچے ہوئے دن کو گزارنے کے لئے ۔ اپنے بیٹوں کے شاندار مستقبل کو اپنا مستقبل مان لیا تھا ۔ شاید ان سے یہیں پر بھول ہوئی تھی ۔

شمشاد اور اس کی بیگم نے تقریباً ان سے بات کرنا بھی بند کر دیا تھا ۔ بس وقت بے وقت کھانا اور ناشتہ کے نام پر چند روٹیاں سامنے ڈال دی جاتیں ۔ خواہش نہیں ہونے کے باوجود چند لقمہ انھیں کھانا پڑتا ۔ ظالم زندگی ختم ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھی ۔

دُکھ، درد کے شدید احساس نے انھیں فکرمند بنا دیا تھا ۔ کھانے پینے سے لاپرواہی اور دواؤں کی عدم موجودگی نے دن بہ دن انھیں بے حد کمزور کر دیا ۔ ایک دن باتھ روم سے نکلتے وقت توازن برقرار نہ رکھ سکے اور گر پڑے ۔ تکلیف کی شدت سے وہ کراہنے لگے، دن بھر وہ اسی طرح

بستر پر کراہتے رہے۔ شام کے وقت شمشاد دفتر سے لوٹے تو بہو نے انہیں کچھ سمجھایا۔ بات شمشاد کی سمجھ میں آ گئی۔ اور فوراً ہی ایک آٹو رکشہ کر کے ایک سرکاری ہسپتال میں ڈال آئے۔ ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد بتایا کہ کمر کی ایک ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔

شمشاد ڈاکٹر کی بات سن کر گھر چلے گئے اور پھر لوٹ کر واپس نہ آئے۔ سرکاری ہسپتال کے ڈاکٹروں سے جب ان کی کراہ اور تکلیف نہ دیکھی گئی تو مجبوراً رحم کھاتے ہوئے ایکس رے کرا کر پلاسٹر کر دیا اور ایک بستر پر ڈال دیا۔ بستر پر پڑے پڑے ہر لمحہ ان کی نگاہیں ہسپتال کے داخلی دروازے پر ٹکی رہتیں۔ شاید شمشاد، بہو یا بچے...... اتنے بے درد اور بے رحم ہو جائیں گے، یہ لوگ.....

عضو معطّل کی طرح وہ ہسپتال کے بستر پر یہاں کے عملہ کے رحم و کرم پر پڑے ہوئے تھے اور جب بھی کوئی نرس یا ڈاکٹر ان کے قریب آتا وہ اس سے بس ایک ہی سوال کرتے کیا یہاں Old Peoples Home نہیں ہے، پلیز، مجھے وہاں پہنچا دو، پلیز.....

ان کی ہر وقت کی فریاد اور التجا سن کر ایک مریض کو دیکھنے آئے شخص نے کہا۔

"کیا اِس بڈھے کو معلوم نہیں ہے کہ یہاں Old Peoples Home قبرستان کو کہتے ہیں!"
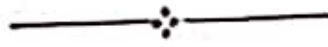
سیّد احمد قادری مشاہیر کی نظر میں

اصغر علی انجینئر

سید احمد قادری زندگی کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں اور زندگی اور اس کے پیچیدہ تقاضوں سے اپنی کہانیوں میں بخوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ کہانی ان کے یہاں کہانی ہی رہتی ہے۔ کیونکہ کہانی کہنے کا فن انھیں خوب آتا ہے۔ یہ زندگی کو پھلتے پھولتے دیکھنا چاہتے ہیں اور یہی ان کی نظریاتی وابستگی ہے۔ سارتر کے مطابق لکھنے کا فعل ہی وابستگی کا اعلان ہے اور قادری کی ہر کہانی یہ اعلان مبہم نہیں بڑے واضح طور پر دھیرے نہیں بیانگ دہل کرتی ہے۔

"ریزہ ریزہ خواب" قادری کی بیس کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں بعض کہانیاں کمزور ہیں، بعض اچھی اور بعض بہت اچھی بھی۔ مجموعے کا نام بھی احمد قادری کی زندگی کے رویئے کا اعلان کرتا ہے۔ زندگی ایک سُندر سپنا بھی ہے اور انسان کو ریزہ ریزہ کر دینے والی حقیقت بھی۔ ایک تخلیقی فنکار سُندر سپنا دیکھ کر ریزہ ریزہ کر دینے والی حقیقت کو بھی گوارا بنا لیتا ہے۔ اس کی بہترین مثال قادری کی کہانی "سُرخ جوڑے" ہے۔ یہ کہانی قادری کی بہترین کہانیوں میں شمار کی جائے گی۔

○ ڈاکٹر عبد المغنی

سید احمد قادری کے افسانوں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں زبردست عصری حسیت اور انسانیت کا ایک شدید احساس ہے۔ چنانچہ فنکار نے اپنے موضوعات کا انتخاب بہت چابکدستی اور حاضر دماغی سے کیا ہے۔ اس نے سماج اور شخصیت کے کانٹے چُن چُن کر ان میں فن کا پھول بنانے کی کوشش کی ہے۔

○ تاراچرن رستوگی

قادری صاحب کے افسانوں کے خواب "خواب پریشاں" نہیں بنتے اور اسی لئے ان کے جمالیاتی ادراک میں غم دوراں کی کسک بھی ہے اور اس کسک کا سامنا کرنے کی تاب و توانائی بھی ہے..........

قادری افسانہ نگاری کے فن سے کماحقہٗ واقف ہیں۔ عرفان ذات و حیات کے حامل یہ افسانے منفرد مقام و مرتبہ کے افسانے ہیں۔ ریاست بہار ہمیشہ سے افسانہ نگار پیدا کرتی رہی ہے۔ ہت اپدیش، جاتک کتھائیں قبل مسیح اسی خطہ میں لکھی گئی ہیں۔
سید احمد قادری ہر اعتبار سے بہت بڑا افسانہ نگار ہے۔

○ وارث علوی

مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ کو قصّہ گوئی کا طور ہاتھ آگیا ہے اور مجھے خوف ہے کہ یہی چیز آپ کے لئے مُضر ثابت ہوگی۔ یہ باتیں میں نہ لکھتا اگر آپ میں افسانہ نگاری کی صلاحیت نہ پاتا۔

○ ڈاکٹر وہاب اشرفی

قادری جو کچھ لکھ رہے ہیں، سوچ سمجھ کر لکھ رہے ہیں۔

○ ڈاکٹر عنوان چشتی

" ریزہ ریزہ خواب " کو پڑھ کر میں نے سیّد احمد قادری کے تخلیقی تجربوں میں شرکت کی اور اپنے ذہن و فکر کے نگار خانے میں ایسے مانوس جلوؤں کو رقصاں پایا جو ادبی روایت کی مخصوص خصوصیت سے ابھرتے ہیں۔

○ ڈاکٹر علیم اللہ حالی

سیّد احمد قادری کا موضوعاتی RANGE خاصا وسیع و عریض ہے۔ ان کے افسانوں میں کنارہ دور" "اجنبی راہیں" "شہر خموشاں" "لمحوں کی بازگشت" "یادوں کا المیہ" "گمشدہ اُجالے" اور "قیدی" وغیرہ کے ذریعہ جہاں اس موضوعاتی وسعت اور تنوع کا اندازہ ہوتا ہے وہیں ان کا مخصوص اسلوب بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہ بیانیہ پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ وہ الفاظ و علائم کی ساحری سے ہمیں لبھانے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ خارجی واقعات و واردات سے اخلاقی نکتے پیدا کر کے اپنی تخلیقات کی معنویت اور افادیت منوا لیتے ہیں۔ معاصر افسانہ نگاروں میں وہ اپنی انسانیت دوستی، اقدار نوازی، غایت سنجیدگی اور متانت کی وجہ سے صاف صاف پہچانے جاتے ہیں۔ کلام حیدری نے انھیں شہر افسانہ نگاری کا معزز شہری کہا ہے۔ ان کا یہ اعزاز متذکرہ بالا خصوصیات سے قائم ہوتا ہے۔

○ سرسوتی سرن کیف

Some people have branded Quadri as having a progressive

orientation. I do not see any such thing in these pieces. Only three stories deal with financial problems, nine stories depict psychology in varied but commonly known situation is sort of monotony of style there is a great variety of situations and problems. It can be said that these stories cover as much of life as is possible in a single book.

○ Sarsawti Saran Kaif (The pioneer)

○ غیاث احمد گدّی

جدید تر اُردو فکشن کی دنیا میں سیّد احمد قادری کی آمد علامتی اور تجریدی نظامِ اظہار کے نام پر ژولیدہ بیان اور فنکارانہ خامکاری کی بوجھل فضا میں ہوا کے خوشگوار جھونکے سے کم نہیں۔ اظہار بیان کی صفائی، ماجرا سازی اور کردار نگاری کا دروبست، تہہ در تہہ زندگی کا عرفان اور اس سے گہری وابستگی سید احمد قادری کی تخلیقی جہت کی نمایاں پہچان ہے۔

○ رام لعل

نئے لکھنے والوں میں ایک نام سیّد احمد قادری کا بھی ہے جو افسانہ اور تنقید پر خاصی قدرت رکھتا ہے جن کے افکار سے نہ صرف افسانے کی روایت قائم رہتی ہے بلکہ اس میں عصری تقاضوں کا اہتمام بھی ہے۔

○ کلام حیدری

قادری کے تقریباً سبھی افسانوں میں ایک قدرِ مشترک یہ ہے کہ وہ مسئلوں کو افسانے،

نہیں بناتے، ان کے افسانوں سے مسئلوں کی نشاندہی ہوتی ہے ۔ وہ حل کے چکر میں بھی نہیں پڑتے، کیونکہ سوا ان کا OBJECT ہوسکتا ہے TARGET نہیں ہے ۔

○ جوگندر پال

"ریزہ ریزہ خواب" کی کہانیاں میں نے بڑی دلچسپی اور انہماک سے پڑھی ہیں۔ کسی بھی فنکار کے یہاں اس کے امکانات کی دھوپ چھاؤں میں دراصل اس کی سچائیوں کی صلاحیت کا ہاتھ رہتا ہے۔

○ احمد یوسف

سید احمد قادری کا تعلق افسانہ نگاروں کے اس قافلے سے ہے جو افسانے میں کہانی کے عنصر کو بے حد اہم قرار دیتا ہے کہ افسانے نے اسی زمین سے جنم لیا ہے ۔

○ بدرا اورنگ آبادی

جہیز کی لعنت کی بدولت لڑکیوں کی شادی میں دشواریوں کی کئی مثالیں قادری کے علم میں تھیں ۔ اس کا حساس دل تڑپ اُٹھتا تھا اور اس کی یہ تڑپ اور چبھن " سرخ جوڑے " کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اگر یہ کہانی قادری کے بجائے کوئی دوسرا افسانہ نگار بھی لکھتا تو میں یہی کہتا کہ یہ اردو فکشن میں کئی جہت سے ممتاز حیثیت رکھتی ہے اور اس کہانی کی اہمیت کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ اس کا ترجمہ انگریزی کے مؤقر روزنامہ " PATRIOT " میں چھپا۔ " اُداسیاں " کے پنشن یافتہ بوڑھے انکل کی آنکھوں میں تنہائی کے باعث جب آنسو تیرنے لگے تو بچوں کو بڑی حیرت ہوئی اور وہ پوچھتے ہیں ۔" انکل، تم کیوں رو رہے ہو؟" اور جواب ؟" تم ان آنسوؤں کو نہیں سمجھو گے میرے بچو، اس وقت تک جب تک کہ

یہ آنسو تمہاری آنکھوں سے نہ گریں"۔ کون سا دل ہے جو اِس سیدھے سادے جملے سے تڑپ نہ اُٹھے۔ یہ معمولی سا جملہ ہر دل میں چبھن پیدا کر دینے پر قادر ہے۔

یہ ہے قادری کے فن کا کمال اور اس کی شناخت۔ "آنگن کی بات" بہ قول ڈاکٹر حسین الحق "سید احمد قادری کی بتدریج ارتقائی رویئے کا ثبوت ہے۔ یہ کہانی دراصل عہد حاضر کے اس اجتماعی رویئے کی نشاندہی کرتا ہے جو بزرگوں اور ماضی سے اجتماعی بے نیازی اور لاپرواہی کا اشاریہ ہے"۔

○ مُعین شاھد

سیّد احمد قادری کو اپنی باتوں کو کہنے کا سلیقہ آتا ہے۔ وہ اپنے احساسات اور جذبات کو افسانوں میں اس طرح فنی طور پر پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

○ شفق

سید احمد قادری بیانیہ کے اس پُل صراط سے کامیابی سے گذر جاتے ہیں جس پر اکثر جدید افسانہ نگار قدم رکھتے ہوئے ڈرتے ہیں اور رکھنے کی کوشش انہیں دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ عہد حاضر کے اُلجھے ہوئے سلگتے مسائل اور بیانیہ اسلوب کی وجہ سے قاری پوری توجہ سے ان کی باتیں سنتا ہے۔ چاہے وہ آنگن کی بات ہو یا سسکتے لمحوں کا کرب، لمحوں کا درد ہو یا قیدی، بند آنکھوں کا سپنا، فاصلہ قریب کا ہو یا کنارہ دور کا، یہ باتیں جو جگ بیتی ہیں آپ بیتی معلوم ہوتی ہیں۔

○ شوکت حیات

نئی نسل کے افسانہ نگاروں میں سید احمد قادری نمایاں نظر آتے ہیں ان کے یہاں سماجی اور سیاسی شعور کو افسانوی قالب میں ڈھالنے کی ہنرمندی، انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے۔ کہانیوں میں واقعات کو پوری تہہ داری کے ساتھ پیش کرنے کا سلیقہ ان کی کہانیوں کی معنویت میں اضافہ کرتا ہے۔

○ م۔ق۔خاں

Quadri's pen has all along been fighting a crusade against social injustice, exploitation of the weaker classes of the society. Wheather it may be labour or a women. He picks up his characters from his own sarrounding. He never lets his fancy room at large in the world of dream or abstract or airy.

○ ***Dr. M.Q. Khan (Indian Nation)***

○ حمید سہروردی

سید احمد قادری معاشرتی و معاشی مسائل سے باخبر ہیں اور ان مسائل میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کا افسانہ اپنے پیش رو افسانہ نگاروں کی طرح المیہ اور نشاطیہ نہیں ہوتا۔ انہوں نے فرد کی بے بسی اور مجبوری فطری انداز میں درکردی ہے۔ ان کے افسانے زندگی سے باتیں کرتے ہیں 'خواب' کی نہیں۔

○ رضوان احمد

سید احمد قادری کے افسانے تکنیک، بیان، فکر اور اسلوب کا منفرد منظر نامہ پیش کرتے ہیں
ان کے افسانے ایک جانب جہاں عرفانِ ذات کا وسیلہ بنتے ہیں، وہیں کائنات کی
وسعتوں میں پھیلتے چلے جاتے ہیں۔

○ تاج انور

سید احمد قادری صرف بیرونی مناظر نہیں پیش کرتے بلکہ محسوسات کے نہاں خانوں، کشمکش،
پیچیدگی اور درد و کرب کی لہروں کو بھی سمیٹ کر اپنی انتہائی مشّاقی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

○ مشتاق احمد نوری

سید احمد قادری نے زندگی کی ساری سچائیوں کو پوری ایمانداری سے محسوس کیا ہے اور ساری
کڑواہٹ کو اپنے حلق کے اندر اتارا ہے پھر ان امانتوں کو کہانی کی شکل میں ہمارے سامنے
رکھ دیا ہے۔

○ نور الحسنین

سید احمد قادری وہ خوش نصیب افسانہ نگار ہیں جنہیں پہلی کتاب ہی سے شہرت،
عزت اور مقام ملا۔ ان کے افسانوں کو پڑھتے وقت اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حقیقت نگاری
کے فن پر حاکمانہ گرفت رکھتے ہیں ......

سید احمد قادری کی بہترین کہانیوں میں شہر خموشاں، منظر یوں تھا، قیدی، یادوں کا المیہ،
اجنبی راہیں، خواب، کنارہ دور اور گمشدہ اجالے موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے بہت اہم ہیں۔

○ تسکین زیدی

سیّد احمد قادری نئی نسل کے ان کہانی کاروں میں ہیں جنہوں نے پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ ان کے یہاں عصری مسائل کا پورا احساس ملتا ہے۔

○ ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی

سیّد احمد قادری کی قوّت مشاہدہ میں باریکی ہے، واقعیت اور تیز حسابیت بھی۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں سماجی حقائق کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے کی کاوش کی ہے اور اس کاوش میں انہیں کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔

○ ڈاکٹر مناظر عاشق ھرگانوی

سیّد احمد قادری نے تہہ بہ تہہ زندگی کو جس طور دیکھا، محسوس کیا اور بھوگا ہے، اسے بیانیہ طریقے سے افسانے کا روپ دیا ہے۔ آج کے سماج میں جو جبر ہے، دھوکہ، فریب، استحصال، ظلم، تشدد، انتشار، افراتفری، گھٹن، مایوسی اور مجبوری ہے اسے اپنے افسانوں کی معنویت میں پیش کیا ہے۔

○ ڈاکٹر حسین الحق

سیّد احمد قادری تیسری آواز کی نمائندگی بڑی کامیابی سے کر رہے ہیں۔

○ شہنشاہ مرزا

جب سیّد احمد قادری خالص بیانیہ انداز کے افسانے لے کر سامنے آئے تو تھوڑی تبدیلی کا احساس ہوا۔

○ ڈاکٹر جاوید حیات

استحصال سید احمد قادری کا پسندیدہ موضوع ہے۔ چنانچہ اس کے مختلف روپ مختلف افسانوں میں دکھائی دیتے ہیں۔

○ عثمان عارف

سید احمد قادری کے اسلوب کو فیصلہ کن اسلوب یعنی DICISIVE STYLE کے زمرے میں رکھنا پسند کروں گا۔ ان کا اسلوب، خیال میں اس طرح داخل نظر آتا ہے۔ گویا پھول میں رنگ اور خوشبو، وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس کے لئے مناسب و موزوں الفاظ، لب و لہجہ اور طرز ادا اختیار کرتے ہیں اور اسی لئے کہیں تصنع پیدا نہیں ہوتا۔

○ خورشید حیات

سید احمد قادری کی کہانی جو سیدھے سادے انداز میں مدھم سُروں سے شروع ہوتی ہے۔ وہ ارتقا کی منزل تک پہنچتے پہنچتے ایک ایسی صورت اختیار کر لیتی ہے کہ ایک ایک لفظ قارئین کے لئے جہانِ معنی پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔

○ شیریں اختر

سید احمد قادری نے اپنے مشاہدات و موضوعات کو جس فنی مہارت سے افسانے کے سانچے میں ڈھالا ہے وہ انھیں دیگر افسانہ نگاروں میں ممتاز کرتا ہے۔

"دھوپ کی چادر" سیّد احمد قادری کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ ان کے افسانوں کا پہلا انتخاب "ریزہ ریزہ خواب" کے نام سے کم و بیش دس برس قبل شائع ہوا اور مقبول بھی۔ کیونکہ سیّد احمد قادری نے "جہانِ افسانہ" میں وقت بے وقت چلنے والی ناخوشگوار، بے ہنگم اور تیز و تند ہواؤں سے خود کو ہمیشہ محفوظ رکھا اور کہانی کے بعض بنیادی تقاضوں پر بڑی سختی سے قائم رہے۔ چنانچہ اس زمانے میں بھی جب ان کے معاصر افسانہ نگار قبل از وقت شناخت کے چکّر میں نجی علامتوں اور تجریدوں کی بیساکھی تلاش کرتے میں ایسے گم ہوئے کہ اپنے "امکانات" بھی کھو بیٹھے مگر یہ خشوع خضوع کے ساتھ پریم چند کی مستحکم افسانوی روایت سے جڑے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اُردو افسانوی ادب میں کئی گراں قدر اضافے کرنے میں کامران رہے۔ ان کے افسانوں کی بنیادی شناخت معمولی تجربے، مشاہدے، حادثات اور واقعات کو غیر معمولی سادگی سے بیان کرنا ہے۔ نیز ان کے افسانوں میں "کہانی پن" یا "افسانویت" کا احساس لگاتار قائم رہتا ہے۔ "دھوپ کی چادر" کے کئی افسانے عصرِ حاضر کے نوحے بھی ہیں اور کامیاب فن پاروں کے نمونے بھی۔

سیّد احمد قادری چونکہ کامیاب صحافی بھی ہیں اس لئے کبھی کبھی ان کے افسانے صحافت کے قریب ہوجاتے ہیں۔ وہ یقیناً اس سے اجتناب کی سعی کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ادب اور صحافت دونوں کو زیر کر رکھا ہے۔ اسی لئے اگر ادب کے حوالے سے ان کی خدمات کے اعتراف میں محکمۂ ثقافت، حکومتِ ہند، نئی دہلی نے انھیں ۱۹۹۲ء کے فیلوشپ ایوارڈ سے سرفراز کیا تو ۱۹۹۵ء میں کے۔کے۔ برلا فاؤنڈیشن (ہندوستان ٹائمز گروپ، نئی دہلی) نے ان کی صحافتی کارگذاریوں کو تسلیم کرتے ہوئے فیلوشپ ایوارڈ سے نوازا۔

سیّد احمد قادری چونکہ ایک فعال ادیب اور بے باک صحافی ہیں، اس لئے یقین ہے کہ اردو افسانے اور صحافت کے نئے منطقے کی تلاش میں وہ بامراد رہیں گے۔

_____ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم
شعبۂ اردو،
دہلی یونیورسٹی، دہلی۔